دلچسپی سے مرتب کیا ہے، اور اس کے لیے وہ حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔

مضامین وحشتؔ:۔ مرتبہ جناب جمال احمد صدیقی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۲۴۰، مجلد مع گردپوش، قیمت ۱۷ روپیے، پتہ: مغربی بنگال اردو اکاڈمی ۱۷/۶ اے، ری موہن ایونیو کلکتہ ۱۷۔

جناب رضا علی وحشتؔ مرحوم کلکتہ کے مشہور ادیب و شاعر تھے، ان کے قلم کی روانی نظم و نثر دونوں میں یکساں تھی، انھوں نے مشق سخن کے ساتھ بہت سے ادبی و تنقیدی مضامین بھی لکھے تھے، زیر نظر کتاب ان کے چھوٹے بڑے پندرہ مضامین کا مجموعہ ہے، پہلے اردو کے قدیم شاعر ولیؔ گجراتی کی شاعری پر سیر حاصل مضمون ہے، اس کے بعد شیخ علی حزیںؔ پر مبسوط مضمون ہے، ان دونوں میں ان شعراء کے کلام کا جائزہ لے کر ان کے لفظی و معنوی محاسن دکھائے ہیں، کہیں کہیں دوسرے شعراء سے ان کا موازنہ بھی کیا ہے، اور شیخ علی حزیںؔ کے مختصر حالات بھی تحریر کیے ہیں، اور مختلف عنوانات کے تحت ان کے کلام کا انتخاب بھی دیا ہے، ایک مضمون میں پنجاب کے فارسی گو شاعر غنیمتؔ کی قادر الکلامی دکھائی ہے، چند مضامین میں اردو غزل میں اصلاح کی ضرورت واضح کی ہے، اس سلسلہ میں مولانا حالیؔ مرحوم کی اصلاحی کوششوں کا ذکر بھی کیا ہے، اور ایک مستقل مضمون میں ان کی غزل گوئی پر اظہار خیال کیا ہے، جناب عندلیب شادانی کے نام ان کا ایک طویل مکتوب بھی درج ہے، جس میں شعر و ادب کے دلچسپ نکتے بیان کیے ہیں، دوسرے مضامین میں بنگال کی اردو خدمات کا اجمالی جائزہ اور چند بنگالی شعراء کے خصوصیات کلام پر بحث کی ہے، ان مضامین میں اہل بنگال کی اردو بیزاری کا گلہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے: "یہ وہی بنگالہ تھا جو بلا تفریق مذہب و ملت اردو کی خدمت کرتا تھا، اب وہی بنگالہ ہے کہ ایک مسلمان کے اردو بولنے پر کوئی غیر مسلم نہیں بلکہ ایک مسلمان اپنے تیور بدل لیتا ہے، اور اردو بولنے والے کو نفرت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے، وہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اردو بولنے والوں کو ہر قسم کا نقصان پہونچانا اپنا قومی و ملکی فرض سمجھتا ہے ع تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو"، افسوس کہ بنگال کے لوگوں نے اپنے اس مایۂ ناز فرد کی دردمندانہ شکایت کا کوئی اثر قبول نہ کیا بلکہ ان کے رویہ میں مزید شدت پیدا ہو گئی ہے، جس کا وقتاً فوقتاً مظاہرہ بھی ہوتا رہتا ہے، یہ مضامین بہت پہلے لکھے گئے تھے، اب نئے رجحانات نے شعر و ادب اور تنقید کے دائرہ میں بڑی وسعت پیدا کر دی ہے، لیکن خالص ادب کی تر و تازگی میں فرق نہیں آتا، اس لحاظ سے اس گلدستۂ ادب کی اشاعت پر مغربی بنگال اردو اکاڈمی تحسین کی مستحق ہے۔

"ض"

جلد ۱۳۶ ماہ محرم الحرام سنہ ۱۴۰۶ھ مطابق ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۸۵ء عدد ۴

مضامین

شذرات — سید صباح الدین عبد الرحمن — ۲۴۲-۲۴۴

مقالات

مستشرقین کے متعلق دو متضاد رائیں — مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم، سابق ناظم دار المصنفین — ۲۴۵-۲۵۲

حضرۃ الاستاذؒ کی اہم تصنیف تاریخ ارض القرآن پر ایک نظر — سید صباح الدین عبد الرحمن — ۲۵۹-۲۷۴

وراثت؛ کتاب منزل بمنزل — مولانا محمد عبد الحلیم چشتی، کانو، نائیجیریا — ۲۷۵-۲۸۴

آثار علمیہ

گذارش احوال واقعی — جناب شیخ نذیر حسین صاحب، مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لاہور — ۲۸۵-۲۸۶

بابُ التقریظ والانتقاد

زندہ رود جلد سوم — سید صباح الدین عبد الرحمن — ۲۸۷-۳۱۲

مطبوعات جدیدہ — "ض" — ۳۱۳-۳۲۰

شذرات

اخباروں کی یہ خبر پرانی ہو چکی ہے کہ ایک فرقہ پرست، مردم بیزار، مسلم آزار اور ملک دشمن شخص نے کلکتہ ہائی کورٹ میں ایک درخواست داخل کر کے اس ملک میں کلام پاک کی اشاعت کو ممنوع قرار دینے کی کوشش کی۔

یہ درخواست ہائی کورٹ سے خارج کر دی گئی تھی، مگر کلکتہ کے مشہور ایڈووکیٹ جناب خواجہ محمد یوسف کے ایک مکتوب سے معلوم ہوا کہ مدعی نے ہائی کورٹ کے فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کی درخواست دی ہے، اس کا یہ بھی اعلان ہے کہ وہ سپریم کورٹ میں بھی اپیل کرے گا، اس کے پیچھے جو مقصد کار فرما ہے اس پر اظہار کرنے کی ضرورت نہیں، البتہ اس کی طرف توجہ دلائی ہے کہ کلام مجید میں یہ صدائے ربانی ہے کہ جن لوگوں نے قرآن کے پیش کردہ راستہ کے خلاف دوسرا راستہ پسند کیا ہے تو اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے (۲ : ۷) اور اگر انھوں نے اللہ کے بتائے ہوئے طریقہ پر چلنے سے انکار کر دیا ہے تو ان کی حالت بالکل ایسی ہی ہے جیسے چرواہا جانوروں کو پکارتا ہے اور وہ ہانک پکار کی صدا کے سوا کچھ نہیں سنتے، وہ بہرے گونگے اور اندھے ہیں، اس لیے کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی (۲ : ۱۷۱) کلام پاک میں یہ بھی ہے کہ کون ہے جو ابراہیمؑ کے طریقہ سے نفرت کرے، وہی جس نے خود اپنے آپ کو حماقت و جہالت میں مبتلا کر لیا، اس کے سوا کون یہ حرکت کر سکتا ہے۔ (۲ : ۱۳۰)

قرآن پاک ہی میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایسے لوگ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، زیادہ سے زیادہ بس کچھ ستا سکتے ہیں۔ (۳ : ۱۱۱) کیونکہ کلام پاک کی تعلیمات کچھ ایسی اعلیٰ اور اٹل ہیں کہ ان کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا، مسلمانوں کو فخر ہے کہ یہ تمام انبیاءؑ کی تعلیمات کا عطر مجموعہ ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی ننانوے (۹۹) صفتوں کا ذکر ہے، جن میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ رحمٰن (نہایت مہربان)، رحیم (بار بار رحمت کرنے والا)، ذوالجلال والاکرام (صاحب جلال و عظمت)، ستّار (چھپانے والا)، غفّار (بخشش کرنے والا) غفور رحیم (بخشنے والا اور رحم کرنے والا) العدل (سراپا انصاف)، العفو (معاف کرنے والا) الوہاب (عطا کرنے والا)، الحلیم (بردبار)، الصبور (بندوں کی

گستاخیوں پر صبر کرنے والا) التواب (بندوں کے حال کی طرف رجوع کرنے والا) البر (نیک اور مجسم خیر) المقسط (عادل اور منصف) ہے۔

جب وہ اپنے کو ودود کہتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ بے پناہ محبت کرنے والا ہے، یا جب وہ اپنے کو رؤف کہتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ ویسے ہی محبت کرتا ہے جیسا باپ اپنے بیٹے سے کرتا ہے، یا جب وہ اپنے کو حنّان سے یاد کرتا ہے تو اس سے یہ مراد ہے کہ وہ ایسی ہی محبت والا ہے جیسی ماں کو اپنے بیٹے سے ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی ان صفتوں کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ وہ اپنے بندے سے یہی چاہتا ہے کہ وہ اس کے ان صفات کو سامنے رکھ کر دنیا میں اس کے بندوں سے پیش آئیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں اپنے بندوں کو نماز پڑھنے کا اس لیے حکم دیتا ہے کہ نماز کھلی بدکاریوں اور ناپسندیدہ باتوں سے روکتی ہے (عنکبوت : ۵) وہ روزے رکھنے کو اس لیے کہتا ہے کہ ان سے روزے رکھنے والوں کو تقویٰ حاصل ہوتا ہے، (بقرہ : ۴۴) وہ زکوٰۃ کو ضروری اس لیے قرار دیتا ہے کہ اس سے دل کی صفائی اور غریبوں کی مدد ہوتی ہے (الیل) اس نے حج کی اہمیت اس لیے رکھی ہے کہ چند معلوم دنوں میں اللہ کی یاد ہو۔ (حج : ۴)

پھر اسی کلام پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے جہان کے لیے رحمت (الانبیاء : ۱۰۷) نیکوں کو خوشخبری سنانے والا، غافلوں کو ہشیار کرنے والا، خدا کی طرف پکارنے والا ایک چراغ بنا کر بھیجا ہے (احزاب : ۴۵)

قرآن مجید کی تعلیمات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت دونوں ایک ہیں، یہ عملی نمونہ کہاں مل سکتا ہے کہ سپہ سالار ایسا کہ مٹھی بھر ہمراہیوں کو لے کر ہزاروں آہن پوش لشکریوں کو پسپا کر دے، مگر صلح کے لیے وہ خواستگار ہوتے ہوں تو اپنی رحم دلی سے صلح کے کاغذ پر بے چون و چرا دستخط کر دیتا ہو، فاتح ایسا کہ مفتوح ہو کر وہ شقی اور ظالم لوگ جن کی تشنہ لبی خون نبوت کے سوا کسی اور چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی سامنے نہتے اور بے بس ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں ان سے یہ فاتح پوچھتا ہے کہ تم کو کچھ معلوم ہے کہ تم سے کیا معاملہ ہونے والا ہے تو وہ پکار اٹھے کہ تو شریف بھائی اور شریف

ہر اور روزادہ ہے، فاتح کی طرف سے اعلان ہوتا ہے کہ تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو، بادشاہ ایسا کہ ابلتے ہوئے خزانوں کے خزانے آرہے ہوں لیکن مہینوں اس کے گھر میں چولھا نہ جلتا ہو، انسان دوست ایسا کہ عرب کے ذرہ ذرہ کی فکر رکھتا ہو، مگر اسی کے ساتھ خدا کے سوا کسی اور کی یاد اس کو نہ ہو۔

قرآن مجید ہی میں مسلمانوں کو یہ کہکر سمجھایا گیا ہے کہ تم تمام امتوں میں بہترین امت اسی وقت ہو سکتے ہو جب تم اچھے کاموں کا حکم دیتے رہو، برائیوں کو روکتے رہو اور اللہ پر ایمان رکھتے رہو (۳: ۱۱۰) پھر تاکید کی گئی ہے کہ تم دنیا کو نیکی کی طرف بلاتے رہو، بھلائی کا حکم دیتے اور برائیوں کو روکتے رہو، تو دنیا میں فلاح پاؤ گے (۳: ۱۰۴) تمھارے لیے برگزیدگی اسی وقت ہے جب تم اللہ کے رشتے کو مضبوط پکڑو، جان اور مال دونوں کو اس کے لیے لٹاؤ، وہی تمھارا آقا ہے جس کا آقا خدا ہو، اس کا کیا ہی اچھا مالک ہے اور کیسا قوی مددگار ہے (۲۲: ۷۸) مزید تصریح کی گئی ہے کہ مسلمانوں کی قوم وہ قوم ہے کہ اگر ہم ان کو حکومت اور بزرگی دے کر دنیا میں قائم کر دیں تو وہ اللہ کی عبادت اور اس کے نام کی تقدیس کو قائم کریں گے، مال و دولت سے انسانوں کو فائدہ پہونچائیں گے اور دنیا سے برائیوں کو مٹائیں گے اور سب کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے (۲۲: ۴۱) کیا یہ ساری تعلیمات ایسی ہیں کہ ان کی ترویج اور تلقین پر پابندی لگا دی جائے۔

اخباروں ہی سے معلوم ہوا کہ کلکتہ ہائی کورٹ میں درخواست دینے والے کا یہ الزام بھی ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں جنگ و جدل بہت رہی اس لیے ان کے قرآن کی اشاعت پر پابندی لگانے کی ضرورت ہے، یہ الزام رکھتے وقت مدعی کو شاید اپنے قدیم ہندوستان کی تاریخ یاد نہیں رہی، ہندوستان کی مقدس کتاب مہابھارت میں تو صرف لڑائیوں ہی کا ذکر ہے، دوسری پوتر کتاب رامائن میں رام اور راون کی جنگ کی تفصیل مزے لے لے کر پڑھی جاتی ہے، موریا، گپت اور کشان وغیرہ کے خاندانوں کی تاریخ میں معلوم نہیں کتنی لڑائیاں ہوئیں، ہندوؤں اور بودھوں کی لڑائیاں تو مذہبی تاریخ میں بہت ہی ہولناک سمجھی گئی ہیں، شودروں سے ہندوؤں کی اونچی ذاتوں کی منافرت تو انسانیت کی تذلیل ہے، راجستھان کے اندر راجپوتوں کی خانہ جنگیاں مشہور ہیں، مرہٹوں، جاٹوں اور بندیلوں کی غارتگری تو ضرب المثل بن گئی تھی، موجودہ دور میں گاندھی جی کا قاتل کون ہے، پھر ایسے لوگوں کی مقدس کتابوں کی اشاعت پر بھی پابندی عائد کرنے کا حکم صادر کیا جا سکتا ہے؟۔

✱

مقالات

مستشرقین کے متعلق دو متضاد رائیں

از

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم، سابق ناظم دارالمصنفین

”یہ تحریر آج سے اکیاونؔ سال پہلے اپریل ۱۹۵۴ء کے معارف میں شایع ہوئی تھی، یہ اس لیے شایع کی جارہی ہے کہ ہمارے ناظرین اس کا مطالعہ کر کے خود فیصلہ کریں کہ ان مستشرقین کے متعلق اب سے پہلے جو رائیں تھیں، وہ اب ویسے ہی باقی ہیں یا کچھ تبدیلی پیدا ہو گئی ہے، یا ہو رہی ہے“ (ص۔ع)

اس سیاسی دور میں جب کہ ہر کام اور ہر عمل کی تہ میں کوئی نہ کوئی غرض پنہاں ہوتی ہے، مشرقیات اور اسلامیات کے متعلق مستشرقین کی تحقیقات کے قبول کرنے کا سوال نہایت اہم ہے، اس میں شبہہ نہیں کہ بہت سے مستشرقین نے مسلمانوں کی بڑی خدمت کی، انھوں نے ساری ساری عمریں اسلامیات کی تحقیق میں صرف کر دیں، اور بڑی جانکاہ محنت اور جانی و مالی قربانی برداشت کر کے مسلمانوں کے علوم و فنون اور ان کی گذشتہ عظمت کو دنیا کے سامنے پیش کیا، ان کی نادر اور نایاب کتابوں کا پتہ چلایا، اور بڑی مشقت اور بڑے اخراجات برداشت کر کے انھیں حاصل کیا، اور نہایت اہتمام اور صحت کے ساتھ شایع کیا، ان پر حواشی لکھے، ان کی شرحیں کیں، مختلف زبانوں میں ان کے تراجم شایع کیے، اسلامی موضوعات پر نہایت بلند پایہ کتابیں تالیف کیں، اور اسلامی علوم و فنون کی ہر شاخ پر نہایت وسیع لٹریچر فراہم

کر دیا جو مسلمانوں سے بھی ممکن نہ تھا۔

ان کی ان اسلامی خدمات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، اور ان کی محنت و جانفشانی کی داد نہ دینا ظلم اور احسان فراموشی ہے، لیکن اسی کے ساتھ جہاں تک مذہب اسلام کے متعلق ان کے افکار و خیالات اور تحقیقات کا تعلق ہے خالص اسلامی نقطۂ نظر سے ان کے قبول کرنے کا سوال نہایت اہم ہے، اس لیے کہ اسلامی مسائل کے متعلق اپنی تحقیقات میں انھوں نے اب تک نیک نیتی کا کوئی ثبوت نہیں دیا ہے، یا تو وہ مشرقی روایات، مشرقی مذاق اور اسلامی ذوق و نظر سے بے گانہ ہونے کی وجہ سے اسلامیات کے سمجھنے اور اس کے پیش کرنے میں نہایت فاش غلطیاں کرتے ہیں، یا عمداً وہ اسلام کو نہایت مسخ شدہ صورت میں پیش کرتے ہیں، بہر حال جو صورت بھی ہو ان کی یہ غلطیاں علم و فن کی خدمت اور تحقیق و ریسرچ کے پردہ میں ہوتی ہیں، یہ زمانہ ریسرچ اور تحقیق کا ہے، اس لیے ان سے خود مسلمانوں اور غیر قوموں میں اسلام کے متعلق سخت گمراہیاں پھیلتی ہیں، بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کو یونانی فلسفہ، عجمی دہریت اور ہندی خرافات، کسی سے اتنا نقصان نہیں پہونچا جتنا ان محققین کی زہر آلود تحریروں سے پہونچا ہے، جس کے مظاہر آئے دن آج کل کے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں میں نظر آتے ہیں، اس لیے مذہب اسلام کے متعلق ان کی تحقیقات پر اعتماد کرنا سخت غلطی ہے۔

ہندوستان کی طرح مصر میں بھی مستشرقین کے بارے میں دو متضاد رائیں ہیں، ایک جماعت ان کی علمی شہرت سے مرعوب ہو کر ان کی ہر جنبش قلم کو بلا چون و چرا مان لیتی ہے، اور دوسری جو ان کی زہر چکانیوں سے واقف ہے وہ ان کی تحریروں کو ناقدانہ نظر سے دیکھتی ہے، حال میں مصر کے دو ممتاز اہل قلم ڈاکٹر حسین ہراوی اور ڈاکٹر زکی مبارک نے علی الترتیب مستشرقین کی مخالفت اور موافقت میں اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں، ذیل میں ان کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ اصحاب اور اہل علم بھی اس مسئلہ کی اہمیت سے واقف ہوں، حسین ہراوی لکھتے ہیں کہ

مستشرقین سے فائدہ سے زیادہ نقصان پہونچا ہے۔

جب ہم یورپین زبانوں کی کسی ایسی تالیف پر نظر ڈالتے ہیں جس میں مشرق یا اسلام کے اجتماعی یا عمرانی موضوع پر مباحث ہوں تو ہم کو بہت سی خلاف عقل و قیاس باتیں نظر آتی ہیں، خصوصاً ان کتابوں میں جو مذہب اسلام پر ہیں، ان میں نہ صرف خلاف حقیقت اور خلاف عقل و قیاس باتیں ہوتی ہیں، بلکہ ان میں اسلام کی ایسی عجیب و غریب اور بھیانک تصویر پیش کی جاتی ہے جسے کوئی مسلمان برداشت نہیں کر سکتا ہے، مشرقی آدمی اس کی یہ تاویل کر لیتا ہے کہ یہ غلطی مشرق کے حالات اور یہاں کے عادات و خصائل سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، اور مسلمان اسلام کی بھیانک تصویر دیکھ کر پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا ہے۔

میں نے یہ رائے ان یورپین تصنیفات کو پڑھ کر قائم کی ہے جن سے بیک نظر ظاہر ہو جاتا ہے کہ لکھنے والے کو عموماً مشرق اور خصوصاً اسلام کی حقیقت سے مطلق واقفیت نہیں ہے، مثلاً: مارشل اپنی کتاب "شادی" میں لکھتا ہے کہ مصر میں اسلامی پردہ کا یہ اثر ہے کہ وہاں چودہ سال کی عمر کے بعد ماں بھی اپنی لڑکی کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی، یا اسی کتاب میں ایک دوسرے موقع پر ہے کہ ریفی مصر کی لڑکی اپنے چہرہ کے علاوہ باقی جسم کے تمام حصوں کو مردوں کے سامنے عریاں کر سکتی ہے، یا کتاب 'شادی اور وراثت کی نسبت' میں ہے کہ اسلام نے پردہ اور تعدد ازدواج کے حکم سے تمدن پر ایک کاری ضرب لگائی ہے، یا اسی کتاب میں ایک اور مقام پر ہے کہ نعوذ باللہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) محض ایک زن پرست آدمی تھے، ان خیالات اور علمی ریسرچ سے لکھنے والے کی نسبت صاف ظاہر ہے کہ وہ حق و انصاف کو پامال کر کے محض اسلام کو بدنام کرنا چاہتا ہے،

یورپین مصنفات کی یہ خوبی ہے کہ اس میں ماخذوں کے حوالے بھی دے دیے جاتے ہیں، جب میں اصل ماخذ کی طرف رجوع کرتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ ان کا ماخذ محض مستشرقین کے دماغ ہیں،

اس میں شبہہ نہیں ہے کہ یورپین زبانوں میں عام خاص تاریخوں اور مختلف قوموں اور ان کے

علمی کارناموں پر نہایت عمدہ کتابیں ہیں، میں نے یہ کتابیں دیکھی ہیں، ان میں دیکھنے والے کو ایک خاص بات نہایت نمایاں نظر آتی ہے کہ جب تک وہ قدیم وجدید تاریخ مثلاً مصر قدیم اور اس کے آثار اور عراق اور اس کی گذشتہ عظمت وغیرہ پر لکھتے ہیں اس وقت تک نہایت محققانہ لکھتے ہیں، لیکن جب اسلامی مباحث یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کا قلم بہک جاتا ہے، اور وہ نہایت لغو، مہمل، ذلیل، رکیک، بلکہ جھوٹ باتیں تک لکھ جاتے ہیں، مثلاً ان کا قلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تصویر پیش کرتا ہے کہ نعوذ باللہ وہ جنگی مذہب کے بانی تھے، اور ان کو انسانی فضائل سے کوئی علاقہ نہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ خرافات بک جاتے ہیں،

مشہور پروفیسر مارگولیتھ جو یورپ میں اسلامیات کے امام فن مانے جاتے ہیں، اور آکسفورڈ میں اسلامیات کا درس دیتے ہیں، اپنی کتاب 'تاریخ العالم' میں یہ نادر تحقیق پیش کرتے ہیں، کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) عبداللہ کے بیٹے ہیں، اور عبداللہ عرب میں اس لڑکے کو کہا جاتا تھا، جس کا باپ لامعلوم ہو، بہت ممکن ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے باپ کا نام عبداللہ بھی اسی وجہ سے پڑا ہو، اگر کوئی معمولی مستشرق اس قسم کی بیہودہ بات کہتا، تو قابل درگذر تھا، لیکن یہ اس شخص کی تحقیق ہے جو یورپ میں عربی کا سب سے بڑا ماہر ہے،

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کو لیجیے، جہاں تک عام تاریخ اسلام کا تعلق ہے، اس میں تمام چھوٹے بڑے مسائل پر نہایت تاریخی استقصاء کے ساتھ بحث ہے، لیکن اسی محققانہ کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نہایت دل شکن اور تکلیف دہ باتیں درج ہیں، اس کی کیا تاویل کی جا سکتی ہے۔

"لجنۃ العمل المغربی" کی تقریروں کے مجموعے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کمیٹی سیاسی استعمار کا ایک دام ہے، جس کا کام مستشرقین کے ذریعہ سے مشرق میں استعمار کی جڑیں مضبوط کرنا ہے، چنانچہ یہ کمیٹی مشرق میں اسلام کے مقابلہ کے گر بتاتی ہے، اور مستشرقین ان پوشیدہ تقریروں کو جن میں اسلام کے مقابلہ کی صورتیں بتائی جاتی ہیں، غیر ملکوں میں اپنی حکومتوں کے پاس بھیجتے ہیں، چونکہ اسلام استعمار کے خلاف ایک زبردست تعلیم ہے، اس سے اسلام کو کمزور کرنے کے لیے یہ چال چلی جاتی ہے کہ شمالی افریقہ اور دوسرے اسلامی ملکوں میں جہاں کی مادری زبان عربی ہے، عربی کی اہمیت گھٹا کر وہاں کے باشندوں کو مقامی زبانوں کے زندہ کرنے کے دام میں پھنسایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کی طرف متوجہ ہو کر عربی زبان بھول جائیں، اور قرآن کے سمجھنے والے باقی نہ رہیں، اس وقت ان کے خیالات اور رجحانات کو اپنے سانچے میں ڈھال لیا جائے، (جیسا کہ آج کل ہندوستان میں ہو رہا ہے، اور اس کے مذموم نتائج بھی نکل رہے ہیں،

یہ تقریر جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، یوروپین مصنفات کی طرح اسلام کے متعلق خرافات کا ایک زہر چکاں مجموعہ تھی، مجھے یورپ کے قیام کے زمانہ میں یوروپین اشخاص سے اسلام پر گفتگو کرنے سے معلوم ہوا کہ ابتدا سے ان کی پرورش ایسے ماحول میں ہوتی ہے جس میں شروع ہی سے اسلام سے نفرت اور مسلمانوں کی تحقیر سکھائی جاتی ہے تاکہ نہ وہ اسلام کی طرف مائل ہو سکیں اور نہ مسلمانوں سے مل سکیں۔

مشرق والوں کو مستشرقین سے کسی خیر خواہی اور ہمدردی کی توقع رکھنا عبث ہے، کہ وہ سانچے ہی مشرق کے مفاد کے خلاف ہیں، جن میں مستشرقین ڈھالے جاتے ہیں، یورپ کی یونیورسٹیوں میں خاص اغراض و مقاصد کے ماتحت طلبہ کو مشرقی زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے، ان میں جو طلبہ پڑھتے ہیں، انھیں مشرق سے کسی قسم کا تعلق ہوتا ہے اور نہ مشرقی زبانوں سے کوئی محبت اور انسیت ہوتی ہے، بلکہ وہ اجنبی طلبہ ہوتے ہیں جنھیں استعماری مشین چلانے کے لیے ان ہی اصولوں پر ڈھالا جاتا ہے جن سے وہ استعماری مشین کا پرزہ بن سکیں، اور اس کا خاص اہتمام رکھا جاتا ہے کہ ان کی قومی عصبیت ضائع نہ ہونے پائے، تاکہ وہ مشرق میں جا کر مشرق یا اسلام کی طرف مائل نہ ہو سکیں، ایسی صورت میں ان سے جن میں بعض آگے چل کر مستشرقین کے زمرہ میں آجاتے ہیں، یا ان کے اساتذہ سے جو بڑے بڑے مستشرقین ہوتے ہیں، مشرق یا اسلام کے ساتھ انصاف کی توقع رکھنا بے کار ہے، مستشرقین خواہ یونیورسٹی کے احاطہ میں استاذ کے لباس میں ہوں، یا ماہر مصنف کی شکل میں، اپنے اصل مقصد کو کسی حالت میں نظر انداز نہیں کر سکتے۔

مستشرقین نے اسلام کے خلاف زہر پھیلانے کے لیے یہ عجیب فریب وہ طریقہ نکالا ہے کہ جب تک وہ

اسلامی تاریخ پر بحث کریں گے اُس وقت تک خالص مورخ رہیں گے، لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، مذہب اسلام یا قرآن کی طرف متوجہ ہوں گے تو ہمیشہ مخالفانہ لکھیں گے کہ دوسرے اس کو پڑھ کر اسلام سے خوفزدہ ہوں، اسلامی مباحث پر لکھنے میں وہ علمی دیانت اور تحقیقی اصول کو بھول جاتے ہیں، ان کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے وہ اپنے ذہن میں ایک نظریہ یا ایک خیال فرض کرتے ہیں، اس کے بعد اس کے اسباب تلاش کرتے ہیں، اگر قرآن میں کوئی ایسی شے مل گئی جو ان کے خیال میں ان کے مفید مطلب ہے، یا اسے کھینچ تان کر اپنے مقصد کے مطابق بنا سکتے ہیں تو فوراً اسے لے لیتے ہیں، اور اگر قرآن ان کے مقصد کے معارض پڑتا ہے تو اسے نظر انداز کر کے کہہ دیتے ہیں کہ قرآن میں ہے ہی نہیں، یہ تنہا میرا سوئے ظن نہیں ہے بلکہ اس کے ثبوت میں واقعات موجود ہیں، اس موقع پر مشتے نمونہ از خروارے دو واقعات پیش کیے جاتے ہیں۔

مثلاً انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے چیف ایڈیٹر موسیو ونسنک جو یورپ میں اسلامیات کے بڑے متبحر عالم مانے جاتے ہیں، اور جن کی رائے اسلامی مباحث پر فیصلہ کا حکم رکھتی ہے، حضرت ابراہیمؑ اور کعبہ کے متعلق لکھتے ہیں:

"اسپرنگر پہلا وہ شخص ہے جس کا ذہن سب سے پہلے ادھر منتقل ہوا کہ قرآن میں ابراہیم کی شخصیت بانیٔ کعبہ کی حیثیت حاصل کرنے سے پہلے کئی دوروں سے گذر چکی ہے، اسپرنگر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرنے اور آیندہ اس موضوع پر لکھنے والے مستشرق کے لیے ایک معمولی سی بنیاد ڈال دی، اس کے بعد سنوک ہرگرونیہ نے اتنا سہارا پاکر ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کر دی اور یہ دعویٰ کر دیا کہ قرآن کی ان سورتوں میں جو پہلے نازل ہوئی ہیں، یا مکی سورتوں میں (مثلاً: ذاریات آیت ۲۴، حجر آیت ۵۰، صافات آیت ۱۰۸، انعام آیت ۷۴، اور مریم آیت ۴۲) میں حضرت ابراہیمؑ کی حیثیت محض ایک رسول کی ہے جو دوسرے انبیا ورسلؑ کی طرح اپنی قوم کو ڈرانے کے لیے مبعوث ہوئے تھے، ان سورتوں میں اسمٰعیلؑ کے ساتھ ابراہیمؑ کے کسی تعلق کا بھی ذکر نہیں ہے، اسی ضمن میں ہمارا مستشرق باتوں باتوں میں اشارۃً عرب میں رسول کی بعثت سے

بھی انکار کر جاتا ہے اور ثبوت میں (سجدہ آیت ۲، سبا آیت ۴۳ اور یٰسین آیت ۵) پیش کر کے کہتا ہے کہ آیات میں اس کا کہیں تذکرہ نہیں ہے کہ ابراہیمؑ کعبہ کے معمار یا پہلے مسلمان تھے۔

"لیکن مدنی سورتوں میں یہ حالت بدل جاتی ہے، اور ابراہیم حنیف مسلم اور ملت ابراہیمی کے بانی ہو جاتے ہیں جنھوں نے اسماعیلؑ کے ساتھ خانہ کعبہ کو بنایا، جیساکہ (بقرہ آیت ۸۸ الخ اور آل عمران آیت ۸۰ الخ) سے ظاہر ہوتا ہے"

ان مفروضہ مقدمات کے بعد پھر یہ نتیجہ پیدا کیا جاتا ہے کہ "اس اختلاف کا راز یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمدؐ نے ابتداءً مکہ میں یہودیوں پر اعتماد کیا تھا، لیکن انھوں نے تھوڑے ہی دنوں کے بعد محمدؐ کے خیالات کو دشمنی پر محمول کیا، اس سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کسی دوسرے مددگار کی ضرورت پیش آئی، اس وقت ان کی ذکاوت اور عقل سلیم نے ابو العرب ابراہیمؑ کی ایک نئی شان کی جانب توجہ دلائی جس کے وسیلے سے ان کو اس زمانہ کی یہودیت سے گلو خلاصی حاصل کر کے ابراہیمؑ کی یہودیت سے جو اسلام کا منشأ اور مولد ہے رشتہ جوڑنا آسان ہو گیا، اور جب مکہ والوں نے ان کے پیغمبرانہ خیالات کو قبول کرنا شروع کر دیا، اس وقت ابراہیمؑ اس مقدس شہر کے مقدس گھر کے بانی ہو گئے۔"

ونسنک کے ان خیالات کو پڑھ کر دھوکا ہوجاتا ہے کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح ہے، اور اس نے اس تحقیق میں استقصاء کے ساتھ قرآن کی ایک ایک آیت کو پڑھ کر یہ رائے قائم کی ہے۔

لیکن اس کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، اس نے اس دعویٰ میں انتہائی خیانت اور بددیانتی سے کام لیا ہے، اور اس کذب صریح سے اس کا مقصد صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تکذیب ہے، اور اس زعم میں یہ آیات قرآنی اس کا ثبوت ہیں۔

وہ نہایت بے باکی کے ساتھ دعویٰ کرتا ہے کہ مکی سورتوں میں ابراہیمؑ کا ذکر معمار کعبہ کی حیثیت سے اور اسماعیلؑ کے ساتھ ان کے کسی تعلق کا ذکر نہیں ہے، اور مدنی سورتوں سے ملت ابراہیمؑ کا ذکر شروع

ہوتا ہے، لیکن یہ تینوں دعوے سراسر جھوٹ ہیں،

سورۂ ابراہیم خود مکی ہے، جس میں نہایت واضح طور پر کعبہ اور ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے تعلق کا تذکرہ موجود ہے۔

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ ، رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَھْوِیْٓ اِلَیْھِمْ وَارْزُقْھُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّکَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِیْ وَمَا نُعْلِنُ وَمَا یَخْفٰی عَلَی اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ وَھَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ (ابراہیم ۶)

اے ہمارے رب! میں نے اپنی کچھ اولاد بے کھیتی والی وادی میں تیرے معزز گھر کے پاس بسائی ہے، تاکہ وہ نمازیں پڑھیں، پس تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دے اور ان کو پھلوں سے رزق دے، تاکہ یہ تیرا شکر ادا کریں، اے ہمارے رب جو کچھ ہم چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اور اللہ پر کوئی چیز چھپی نہیں ہے نہ زمین میں نہ آسمان میں، خدا کا شکر ہے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحٰق دیے، میرا رب دعا کا سننے والا ہے۔

.....

اسی طریقہ سے سورۂ انعام اور سورۂ نحل میں جو مکی ہیں ملت ابراہیمی کا تذکرہ ہے! سورۂ انعام میں ہے:

قُلْ اِنَّنِیْ ھَدٰنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّۃَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا وَّمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ (انعام: ع ۲۰)

(اے پیغمبر!) لوگوں سے کہہ دو کہ میرے رب نے مجھ کو سیدھا راستہ دکھایا ہے اور وہی ٹھیک دین ہے جو ابراہیم کا دین ہے، جو ایک خدا کے ہو رہے تھے، اور مشرکین میں نہ تھے۔ (انعام — ۲)

اور سورۂ نحل میں ہے:

ثُمَّ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّۃَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا وَّمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ (نحل — ۱۲۳)

پھر ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی کہ ملت ابراہیمؑ کی پیروی کرو، جو ایک خدا کے ہو رہے تھے، اور مشرکین میں نہ تھے۔

ان صریح آیات کے بعد ونسنک کے دعوی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مستشرقین اسلامی موضوع پر لکھنے میں علمی دیانت سے کام نہیں لیتے، اور جہاں مذہبی مآخذ ان کے مقصد کے خلاف پڑتے فوراً اس سے انکار کر جاتے ہیں، جیسا کہ اوپر کی مثال سے واضح ہے، تنہا صرف ایک ہی واقعہ میں یہ حالت نہیں ہے، بلکہ وہ عموماً خیانت اور بد دیانتی سے کام لیتے ہیں۔

یہ بھی عجیب نادانی کی بات ہے کہ مستشرقین اسلام یعنی ملت ابراہیمی کو جس یہودیت سے ماخوذ بتاتے ہیں وہ حضرت ابراہیمؑ کی نسل کے بہت بعد کے ایک شخص یہوداہ کی جانب منسوب ہے، جن کا زمانہ حضرت ابراہیمؑ سے سینکڑوں برس بعد ہے، ایسی حالت میں ایک چیز اپنے صدیوں بعد کی پیدا شدہ چیز سے کس طرح ماخوذ ہو سکتی ہے، تعجب ہے کہ اس قسم کے خرافات اور واضح غلط بیانیوں کے بعد لوگ مستشرقین کی تحقیقات کو وحی سمجھتے ہیں، ان کی باتوں پر تو ایک لحہ کے لیے اعتماد نہ کرنا چاہیے۔

اوپر کا بیان ڈاکٹر حسین ہرادی کے خیالات کا خلاصہ ہے، ڈاکٹر زکی مبارک جن کی رائے میں مستشرقین سے فائدہ زیادہ پہونچا ہے، اپنی رائے کی تائید میں یہ دلائل پیش کرتے ہیں:

مستشرقین سے نقصان سے زیادہ فائدہ پہونچا ہے

مستشرقین کی جماعت ایک فاضل اور باکمال جماعت ہے، ان کے ساتھ ہمیں تعلق قائم رکھنا چاہیے اور ان سے تعاون کرنا چاہیے، جو لوگ ان سے علمی اور ادبی تعلقات قائم نہ رکھنے کی دعوت دیتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ:

مستشرقین مستعمرین کی فوج کا طلیعہ ہیں، لیکن بالفرض اگر یہ صحیح بھی مان لیا جائے تو استعمار فی نفسہٖ کون سا جرم ہے، اور وہ اگر کوئی مضر اور قابل نفرت شے ہے تو اس کے انسداد کا یہ طریقہ تو نہیں کہ ہم مستعمرین کے محض دشمن بن جائیں، اور ان سے ہر طرح کے روابط و تعلقات منقطع کر لیں، بلکہ ہمیں اس کی مضرتوں کے روکنے کے مناسب وسائل اختیار کرنے چاہئیں، اور استعمار کے تدارک کے لیے مستعمرین کے علوم و فنون اور ان کے ان اسرار کا پتہ لگانا چاہیے جن کے ذریعہ وہ ہم پر وار کرتے ہیں، اور استعمار کا دام بچھاتے ہیں، میرے نزدیک جو شخص اس کی زحمت گوارا نہیں کرتا اور انھیں ناقابل التفات سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے وہ اپنا اور اپنی قوم دونوں کا دشمن ہے، اس لیے کہ ان کے لٹریچر اور خیالات سے ناواقفیت اور ان کے اغراض و مقاصد کے انسداد سے غفلت و بے پروائی کرنا ان کے مقاصد کو پورا کرنا اور انھیں غفلت میں دام ڈالنے کی جرأت دلانا ہے۔

یہ بھی علی الاطلاق صحیح نہیں ہے کہ سارے کے سارے مستشرقین دام استعمار کا حلقہ ہیں، اور وہ ساری عمر اسی کار خیر میں صرف کر دیتے ہیں، مستشرقیت کی ابتدا اس لیے ہوئی تاکہ یورپین نوجوانوں کو ایسے کاموں کی ترغیب دلائی جائے جس کے وسیلہ سے وہ نو آبادیات میں زندگی بسر کر سکیں، اور اس غرض کے لیے یورپ کے بڑے بڑے ملکوں میں عربی و فارسی وغیرہ بڑی بڑی زندہ مشرقی زبانوں کی تعلیم کے لیے خاص درسگاہیں قائم کی گئیں، جن کے تعلیم پائے ہوئے اکثر سفارتوں، تراجم کے دفتروں اور بعض درس و تدریس کی خدمات انجام دیتے ہیں، ان کی بڑی تعداد ایسے شعبوں میں نکل جاتی ہے جو معاش کے لیے مفید ہوں، اور بہت تھوڑی تعداد مشرقی علوم و آداب کے درس و مطالعہ کے لیے اپنی زندگی وقف کرتی ہے اس شرذمہ قلیل میں آیندہ چل کر بڑے بڑے علماء پیدا ہوتے ہیں، جو ایک عمر کی مشقت اور جد و جہد کے بعد صحیح معنوں میں عالم کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں، ان کے علمی ذوق کی وجہ سے استعمار کی رگ اگر ہوتی بھی ہے تو دب جاتی ہے، اور وہ مشرق کے شرف و عظمت کے بڑے نقیب اور ان کی تہذیب و معاشرت

بلکہ ان کے مذاہب کے بڑے حامی و مددگار بن جاتے ہیں۔

ان کے اس خالص اور بے آمیز مشرقی میلان کا ثبوت بعض مستشرقین کا خالص نظری مسائل کی جانب انہماک ہے جس میں کہیں سے استعماری اغراض کی آمیزش نہیں ہوتی، مثلاً بہت سے مستشرقین بصریوں اور کوفیوں کے صرفی و نحوی مذاہب کے فروق کے درس و مطالعہ میں مشغول ہو جاتے ہیں، اور مصادر کے جمع کرنے اور ان کے نصوص و شواہد اور علمائے فن کے فیصلوں کے طبع و اشاعت میں برسہا برس گذار دیتے ہیں، بعض مختلف قبائل کی بولیوں اور ان کے لہجوں کے اختلاف کی تحقیق میں برسوں صرف کر دیتے ہیں اور اس قبیل کے بہت سے خالص علمی اور بے غرضانہ خدمات انجام دیتے ہیں، ان خدمات کو کون منصف مزاج استعماری اغراض کے ماتحت شمار کر سکتا ہے۔

سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ مستشرقین غلطیاں کرتے ہیں، یہ اعتراض صحیح ہے، لیکن یہ غلطیاں عموماً کسی متن کی شرح میں ہوتی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری زبانوں کی طرح عربی زبان میں بھی خاص رموز اور باریکیاں اور ادائیں ہیں جن کو اہل زبان کے سوا دوسرا نہیں پا سکتا، ان ہی باریکیوں اور اداؤں کی ناواقفیت کی وجہ سے مستشرقین اشعار کے سمجھنے میں نہایت مضحک غلطیاں کرتے ہیں، اس موقع پر اس کی دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں، مثلاً مشہور مستشرق مسٹر مارگولیتھ نے ابو الفتح ابن العمید کے اشعار ذیل:

یقول لی الواشون کیف تحبھا　　　فقلت لھم بین المقصر والغالی

ولولا حذاری منھم لصدقتھم　　　وقلت ھوی لم یھوہ قط امثالی

وکم من شفیق قال مالک واجما　　　فقلت أنا مالی وتسأل ما لی

کے فہم میں نہایت فاش غلطی کی ہے، اوپر کے دونوں شعر اور تیسرے شعر کے پہلے مصرع کے معنی بالکل صاف ہیں، البتہ دوسرے مصرع کے معنی نہیں نکلتے، اس کے سمجھنے میں مسٹر مارگولیتھ گڑبڑا گئے، اور اپنی فہم کے مطابق یہ اصلاح کر دی فقلت انا مالی وان تسألی مالی، حالانکہ ان کی یہ تصحیح پہلی غلطی سے زیادہ مضحک ہے، اگر وہ ابن خلکان کو جس میں یہ مصرع صحیح لکھا ہوا ہے دیکھ لیتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ یہ مصرع اس طرح ہے فقلت تری

مالی وتسائل عن حالی۔

دوسری غلطی مستشرقین کی ایک پوری جماعت سے جو موسیو ڈوزی کے ساتھ نفح الطیب کی تصحیح میں شریک تھی، سرزد ہوئی ہے، انھوں نے ابوالولید کے ان اشعار

الیك اباحفص وما عن ملالة	ثنیت عنانی والحبیب حبیب
مقالا یطیر الحمیر عن جنباته	ومن تحته قلب علیك یذوب

کو جو نفح الطیب میں ہیں، کسی دوسری کتاب میں مقالاً کے لفظ کو مطالاً پڑھ کر لکھ دیا، کہ ان اشعار کے معنی صحیح نہیں نکلتے، اور معلوم ہوتا ہے کہ درمیان سے کوئی شعر حذف ہوگیا ہے، حالانکہ مقالاً ہی صحیح ہے، اور اسی سے صحیح معنی نکلتے ہیں، اس غلطی کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ مقالاً کی ترکیب نحوی کو نہ سمجھ سکے، اگر انھیں معلوم ہوتا کہ مقالاً پہلے شعر کے لفظ الیك کا مفعول بہ ہے تو یہ غلطی نہ ہوتی۔

پہلی غلطی معجم الادبار میں ہے، مارگولیتھ نے نہایت اہتمام کے ساتھ شایع کیا ہے، اور دوسری غلطی نفح الطیب میں ہے، ممکن ہے تلاش کرنے سے دس پانچ اور زیادہ فاحش غلطیاں نکل آئیں، لیکن یہ خفیف غلطیاں اس عظیم الشان خدمت کے مقابلہ میں کیا حقیقت رکھتی ہیں جو مارگولیتھ اور موسیو ڈوزی نے معجم الادبار میں نفح الطیب جیسی اہم کتابوں میں نہایت صحت اور اہتمام کے ساتھ شایع کرکے عربی زبان کی انجام دی ہے، آخرالذکر کتاب اندلس کے اسلامی عہد کی علمی اور ادبی تاریخ کا سب سے پہلا ماخذ ہے، مصر میں بھی یہ کتاب چھپی ہے، لیکن نہایت مسخ شدہ شکل میں، جس میں فہرست تک کا پتہ نہیں ہے، ایسی حالت میں اس عظیم الشان اسلامی خدمت کے مقابلہ میں ان معمولی اغلاط کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہ جاتی۔

دوسرا اہم اعتراض یہ ہے کہ مستشرقین شریعت اسلام کی شرح میں غلطیاں کرتے ہیں، یہ اعتراض البتہ صحیح ہے، بہت سے مستشرقین اسلام کے متعلق ایسے خرافات لکھتے ہیں جو کسی طرح علماء اور محققین کے شایان شان نہیں ہیں، خصوصاً جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر کچھ لکھتے ہیں، لیکن اس میں بھی آپ کی زندگی کے خانگی،

اجتماعی اور تشریعی پہلوؤں پر ان کے خاص نظریے ہیں، جن سے بعض مذہبی پہلوؤں کی خدمت ہوتی ہے۔

میری رائے تو یہاں تک ہے کہ اسلام دشمن مستشرقین نے اپنی اسلام دشمنی کی وجہ سے بھی اس کی بڑی خدمات انجام دی ہیں، مثلاً اس سلسلہ میں انھوں نے قرآن وحدیث اور اس کے متعلقات پر نہایت عمدہ تالیفیں جمع کیں، ان کی فہرستیں بنائیں، ان کی ایسی بہتر تبویب اور ترتیب کی کہ ہمارے شیوخ ازہر سے بھی ممکن نہ تھی، موسیو ڈینسک نے بھی جو ہمارے دوست حسین ہراوی کے تیر ملامت کا سب سے زیادہ نشانہ ہیں حدیث نبوی پر اپنی تالیف سے اسلام کی بڑی خدمت انجام دی، بالفرض اگر ہم منافرانہ طور پر یہ بھی مان لیں کہ اس کتاب کی اشاعت میں حق وصداقت کا جذبہ اور حسن نیت شامل نہ تھا تو بھی اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اس سے غیرارادی طریقہ سے اسلام کی خدمت ہوگئی، آج کل امریکہ اور یورپ میں آثار اسلامیہ کی اشاعت سے زیادہ اسلام کی کون سی خدمت ہوسکتی ہے، اور یہ خدمت مسلمانوں کا فرض تھا، لیکن افسوس انھوں نے اس فرض کو محسوس نہیں کیا، اور اس کو دوسروں پر چھوڑ دیا کہ وہ ان کی میراث میں جو تصرف چاہیں کریں۔

انکار کی زندگی ان پر بحث وتنقید میں ہے، انکار کے لیے یہ قابل افسوس نہیں ہے کہ لوگ اس پر تنقید یا اس کی مخالفت کرتے ہیں، بلکہ افسوسناک یہ ہے کہ اسے نظرانداز کردیا جائے، اور مدحاً اور ذماً اس پر کچھ نہ لکھا جائے، اس لیے اسلام ان کے خیر سے استفادہ کی طرح ان کے شر سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے، میں تیام پیرس کے زمانہ میں بدھ مذہب کے افسانوں اور خرافات کی اشاعت کی کثرت پر رشک کرتا تھا، اور دعا کرتا تھا کہ کاش خدا اسلام کو بھی ایسے خدام عطا کرتا جو ان ممالک میں اس کے فضائل کی اشاعت کرتے۔

مستشرقین نے ہم سے تین صدی پہلے اسلام کے اسلامی اور ادبی درس ومطالعہ کی طرف توجہ کی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج مصر بلکہ مشرق کا بڑے سے بڑا محقق ان کی علمی بحث وتحقیقات کو جو ہر شعبہ میں پھیلی ہوئی ہے نظرانداز نہیں کرسکتا۔

کس قدر شرم اور افسوس کی بات ہے کہ ازہریوں کو جن کو اسلام کا ملجا ومامن سمجھا جاتا ہے، چند برس

پہلے اسلامی تاریخ پڑھانے کا ڈھنگ بھی نہ آتا تھا، کس قدر شرم کی بات ہے کہ آج بھی جامعہ مصریہ کے ادبی کالج میں عربی زبان حاصل کرنے والے طالب علموں کی تعداد سار بن یونیورسٹی کے عربی طلبہ سے کم ہے، کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ پیرس کی السنۂ مشرقیہ کی درسگاہ میں عربی کے اتنے اور ایسے ایسے مطبوعہ ماخذ ہیں کہ مصری دار الکتب میں ان کا نام بھی نہیں۔

مجھے اس کا اعتراف ہے کہ ان کی علمی فضیلت کی وجہ سے ہمارے ذہن و دماغ میں ان کے اثرات زیادہ پائدار ہوتے ہیں، اپنی قوم کو میرا یہ مشورہ ہے کہ وہ ان مستشرقین کے نقش قدم پر ضرور چلیں، لیکن اس کے ساتھ ہم کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ مستشرقین انسان ہیں، فرشتہ نہیں ہیں، ان کے بھی اغراض و مقاصد ہیں، اور وہ بھی انسانوں کی طرح غلطیاں کرتے ہیں، اور چونکہ ان کے پاس خیالات کے نشر و اشاعت کے لیے وسائل زیادہ وسیع ہیں، ان کی یہ غلطیاں پھیل جاتی ہیں، اور ان کا نقش زیادہ پائدار ہوتا ہے، میں مستشرقین کی غلطیوں کو ناقابل التفات نہیں سمجھتا، اور بے سوچے بوجھے ان کی پیروی کرنے کی دعوت نہیں دیتا، لیکن میرا یہ عقیدہ ہے کہ ان کی کوششوں سے لغوی اور اسلامی درس میں زندگی پیدا ہوگئی ہے، اور دنیا میں کوئی چیز خالص شر اور خالص خیر نہیں ہے، لیکن ان علمائے مستشرقین کے کاموں میں نفع کا پہلو غالب ہے۔

سلسلۂ اسلام اور مستشرقین

جلد پنجم

اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر ۱۹۸۲ء میں بین الاقوامی پیمانہ پر دار المصنفین کے اہتمام میں عظیم الشان سیمنار ہوا تھا اس کے بعد اسی موضوع پر تالیفات کا جو نیا اور اہم سلسلہ شروع کیا گیا ہے، یہ اس کی پانچویں جلد ہے، اس میں مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے وہ تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں جو انھوں نے الندوہ اور معارف میں لکھے تھے، مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن، قیمت ۱۵ روپیے۔

حضرۃ الاستاذ کی اہم تصنیف

تاریخ ارض القرآن پر ایک نظر

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

(۳)

پھر ریونڈ فارسٹر ہی کے متعلق سید صاحبؒ لکھتے ہیں:

"ریورنڈ فارسٹر تاکید فرماتے ہیں کہ ہم بغیر کسی شک و سوال کے بنی خزدمین کو بنی جران، سید بنی کو جہینہ اور بنی بری کو کنوان و لاقبیلہ تسلیم کرلیں، اس کی مضحکہ خیز دلیل فاضل ممدوح یہ دیتے ہیں کہ (تقریباً دو ہزار برس کے بعد) برکہارٹ اور نیبہر گذشتہ صدی کے یوروپین سیاحوں نے ان ہی مقامات میں ان ہی قبیلوں کو دیکھا ہے، حالانکہ صاف ظاہر ہے کہ تعدمن خزیمین ہے، سیدی سیدین اور بنو بری بنو بربر ہے، خزیمہ حجاز میں، اسید اور بربر دیگر اطراف میں مشہور قبائل ہیں" (ج ۱، ص ۸)

سید صاحبؒ کا قلم فارسٹر کی تنقید میں رکتا نہیں، اسی کے بعد وہ جو کچھ لکھتے ہیں، اس میں طنز کا رنگ اور بھی گہرا ہوگیا ہے:

"سب سے زیادہ زور ریورنڈ فارسٹر بنی زومین پر دیتے ہیں اور یہ تسلیم کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا مسکن حجاز نہیں بلکہ خلیج عقبہ تھا، اور یہ اس لیے کہ رسلی کے ڈائنڈ ورس نے جو مسیحؑ سے سولہ[16] برس پہلے تھا، لکھا ہے کہ بنی زومین کے ملک میں ایک معبد ہے، جس کی تمام عرب عزت کرتے ہیں، اس معبد کو ان علمائے یورپ نے جن کے نام کا پہلا جزو ریورنڈ نہیں (غیر پادری) کعبہ سمجھا ہے، بلکہ تعجب ہے کہ ایک ریورنڈ نے بھی اپنے قدیم

نقشہائے جغرافیہ میں بنی زومین کو خاص حجاز میں مکہ سے مدینہ تک پھیلایا ہے۔" (ج۱، ص ۷۸)

اس کے بعد سید صاحبؒ نے ایسے ناموں کی ایک فہرست درج کی ہے، جو یونانی تلفظ بخط فارسی کیا ہیں فارسٹر کی رائے میں وہ کیا ہیں، اور خود سید صاحبؒ کی رائے میں کیا ہیں؟ مثلاً یونانی میں بنی زومین ہے، فارسٹر کی رائے میں یہ بنی عمران ہے، لیکن سید صاحبؒ اس کو بنی خزیمہ یا خزیمین قرار دیتے ہیں، اسی طرح یونانی تلفظ سیدنی ہے، اس کو فارسٹر جھینہ اور سید صاحبؒ بنو سید یا سیدمین کہتے ہیں، یونانی تلفظ بنی بری کو فارسٹر بنو بُر بنا دیتے ہیں، لیکن سید صاحب اس کو بنو بر برقرار دیتے ہیں، یونانی تلفظ دیبائی کو فارسٹر کے نزدیک زبید اور سید صاحبؒ کے نزدیک ضبہ ہے، اسی طرح اور مثالیں ہیں۔

سید صاحبؒ نے فارسٹر کی ہر چھوٹی بڑی غلطی کی گرفت کی ہے، مذکورہ بالا فہرست میں یونانی تلفظ داخری موئزانی کو ریونڈ فارسٹر نے دار القرامطہ قرار دیا ہے، اور اس کو واقع بحرین بتایا ہے، اس پر سید صاحبؒ نے حاشیہ میں یہ نوٹ دیا ہے کہ غریب مستشرق کو معلوم نہیں کہ بحرین میں قرامطہ کا وجود بطلیموس کے آٹھ سو برس بعد ہوا ہے، (ج۱، ص ۸۱)

فارسٹر نے عدن کو عدنان سے نسبت دی ہے، سید صاحبؒ اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عدنان کو یمن سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس کا مسکن تو عرب کا شمالی حصہ تھا، (ج۱ ص ۱۸۴) اسی سلسلہ میں وہ ایک اور یوروپی سیاح نیوبھر کی تکذیب یہ لکھ کر کرتے ہیں کہ وہ عدن کو نیمیم کے دوان کے ساتھ تطبیق دیتا ہے، لیکن شاید نیوبھر کو خرتیال کے اس ورس کی خبر نہیں جس میں عدن وددان ایک ساتھ واقع ہیں، (ج۱، ص ۱۸۵)

فارسٹر نے یارح، یعرب اور جرہم کو ایک ہی نام بتایا ہے، لیکن سید صاحبؒ یہ لکھ کر اس کی تردید کرتے ہیں کہ یارح اور یعرب کا اتحاد تو ظاہر ہے، لیکن یارح اور جرہم میں باہم کیا تعلق ہے، یہ غلطی اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ یونانی تلفظ میں جس کی تقلید تمام السنۂ یورپ میں ہے، "ی" "ج" سے بدل کر یرح کا جرح ہو گیا ہے، اس بنا پر ایک یوروپین کی نگاہ میں اگر جرح اور جرہم ایک نظر آئے تو تعجب نہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جرہم خاص

سامی التلفظ نام ہے، یونانی نہیں، کیونکہ اسمائے قدیم کے متعلق عربوں کے معلومات براہ راست یہودیوں سے ماخوذ ہیں جن کی زبان عبرانی و سریانی تھی، یا خود ان کے عربی موروثی روایات ہیں، ان دونوں کے لحاظ سے "ی" اور "ج" کا مبادلہ غیر مسلم ہے، یہ مبادلہ سامی (عبری (عربی) اور غیر سامی (یونانی ولاطینی) کا مبادلہ کبھی نہیں ہوتا، (ج۱، ص ۲۲۶)

فارسٹر نے ایک جگہ حضرت ایوبؑ کا شہر دیا بتایا ہے، وہ جس عربی عبارت کو پڑھ کر اس نتیجے پر پہونچے ہیں اس کو سید صاحبؒ نے نقل کرکے لکھا ہے کہ فارسٹر کو یہ غلطی اس لیے ہوئی کہ وہ اس عبارت کو صحیح طور پر سمجھ نہ سکے (ج۱ص ۳۲)

نولدکی کی بعض تحقیقی تلبیسات پر بھی سید صاحبؒ نے ضرب لگائی ہے، وہ عربوں کے فن انساب کا قائل نہیں، اور وہ لکھتا ہے کہ عربوں کی کتب انساب کو محمد کلبی اور اس کے بیٹے ہشام نے گھڑ لیا ہے، پھر وہ یہ لکھتا ہے کہ یہ کہا جاتا ہے کہ وسط ملک عرب میں قبائل بنی قیس صرف ایک شخص یعنی قیس کی نسل سے ہیں جو مسیح سے کچھ پہلے تھا، یہ لکھ کر وہ دعویٰ کرتا ہے کہ ہماری تحقیق یہ ہے کہ کوئی قبیلہ درحقیقت اپنے اس پدر اول سے واقف نہیں جس کی طرف وہ منسوب ہے، اپنی اس تحقیق کی تائید میں رابرٹسن کی رائے پیش کرتا ہے، جو یہ لکھتا ہے کہ یہ محقق ہو چکا ہے کہ چند قبائل زمانۂ ماضی غیر قدیم میں کسی تاریخی شخص کی طرف منسوب نہ تھے، (ج۱ص ۲۱ و ۲۰) سید صاحبؒ نے ان دونوں کی تحقیق کو یہ لکھ کر رد کیا ہے کہ عرب کا ہر وہ قبیلہ جو غیر پدر کی طرف منسوب ہوتا وہ حقیر اور ذلیل سمجھا جاتا اور بطور نشان ملامت کے اس کا نام لیا جاتا، پھر سید صاحب کے خیال میں انساب کا یاد رکھنا تو عرب میں معمولی بات تھی، شعرائے عرب تو مختلف مواقع کے لیے انساب کو زبانی یاد رکھنے پر مجبور تھے، پھر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایک شخص کی اولاد سے چند بطون و قبائل کا پیدا ہونا کوئی محال امر نہیں، خصوصاً جب اس کی مدت چھ سو برس تک پھیلی ہو (ج۱، ص ۲۱)

سید صاحبؒ کا خیال ہے کہ ان مستشرقین کی اصلی نیت یہ ہے کہ ان قبیلوں کو وہ کسی دیوی، ستارہ، حیوان اور درخت کی طرف منسوب کریں، ایسے انتساب کو وہ طوطمیت کہتے ہیں، اس طوطمیت کے جواز

کے لیے ان کو ایسے قبیلوں میں بنو شمس، بنو اسد، بنو فہد، بنو ثعلب، بنو کلب، بنو نمل وغیرہ جیسے نام ملتے ہیں،

سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ عرب میں اس قسم کے نام صرف چند ہیں، اور یہ کلب (کتا) نمل (چیونٹی) ثعلب (لومڑی) کون سی گرامی قدر چیزیں ہیں، جن کے انتساب سے خاندان کی بنیاد قائم ہو، آج بھی بعض انگریزوں کے نام فوکس اور بل وغیرہ ہوتے ہیں، کیا یہ بھی طوطمیت ہے"؟ (ج ۱ ص ۲۲-۲۰)

نولدکی کا خیال ہے کہ جس زمانہ میں ثمود پوری ترقی پر تھے تو نکے ملک کی زبان نبطی تھی، اس کو یہ خیال اس لیے پیدا ہوا کہ حجر ثمود کا دار الحکومت تھا، اس کی بعض عمارتوں کے کتبات کی زبان نبطی ہے، لیکن سید صاحبؒ کا خیال ہے کہ حجر میں جب تک ثمود رہے' ان کی زبان عربی آرامی تھی، جس کو زیادہ تر لوگ ثمودی زبان کہتے تھے، اور جب وہاں انباط آئے تو وہاں کی زبان نبطی ہو گئی، اسی لیے ان کی عمارتوں کے کتبات میں نبطی زبان پائی جاتی ہے، ورنہ یہ کون صاحب عقل تسلیم کر سکتا ہے کہ ثمود جب اپنی ترقی کے شباب پر تھے، تو اپنی یادگاروں کے لیے ایک غیر قومی زبان اختیار کر لی تھی"، (ج ۲، ص ۱۳۴)

مارگولیتھ کے بعض بیانات پر سید صاحبؒ کو غصہ آ گیا ہے، ملت حنیف کے سلسلہ میں مارگولیتھ لکھتا ہے کہ

"سریانی میں اس کے (حنیف کے) معنی کافر کے ہیں، اور عبرانی میں منافق کے ہیں، مقدس پیروان محمدؐ نے اس کی لفظی تحقیق کی پیروی نہیں کی، (ج ۲، ص ۲۰۹)

اس بیان پر جتنی بھی برہمی ظاہر کی جائے کم ہے، اسی لیے سید صاحبؒ لکھتے ہیں:

"یورپ کے مشرقی تبحر کا خوان یا این ہمہ ادعائے وسعت بہر حال تنگ ہے، اس لیے اس کی ہم کو شکایت نہیں کہ مایۂ ناز فرنگ نہ صرف آغاز تحریک اسلام سے ناآشنا ہے' بلکہ آئین زبان عرب سے بھی آگاہ نہیں، دنیا میں کس نے اپنا امتیازی لقب دشمن کے نام دخاندان پر رکھا ہے؟ اصل یہ ہے کہ نری عربی دانی اور بات ہے' اور اسلامی واقفیت اور چیز ہے ؎

عشق بازاں دیگر اند و عشق سازاں دیگر اند　　آنچہ در فرہاد می بینیم در پرویز نیست"
(ج ۲ ص ۲۰۹)

اس کے بعد سید صاحبؒ نے حنیف کی لغوی تحقیق کر کے بتایا ہے کہ اس کے کیا معنی ہیں، اس کا ذکر گذشتہ اوراق میں پہلے آچکا ہے،

سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ مارگولیتھ کے ساتھ مستشرقین یورپ نے بھی بکمال لیاقت ہم کو یہ بتانا چاہا ہے کہ اللہ اور اللات ایک ہی لفظ کی دو صورتیں ہیں، اللہ مذکر دیوتا کے لیے قریش میں مستعمل تھا، اور اللات یعنی دیوی، اس لفظ اللہ کی تانیث قریش نے بنائی تھی، (ص ۲۲۶) سید صاحبؒ کو اس پر بھی جھلاہٹ آگئی ہے' اور وہ رقمطراز ہیں:

"ان عقلمندوں سے پوچھنا چاہیے کہ اللہ کی تانیث عربی قواعد کے موافق اللات کیونکر ہو سکتی ہے؟ اس کی تانیث اگر ممکن ہے تو اللهۃ چاہیے، یا الالهۃ، اللہ کی ہائے اصلی کیونکر تانیث سے ساقط ہو گئی، ہمارا مشورہ مستحق قبول ہو تو اس زنانہ لفظ کی پیدائش کے لیے عرب کی خشک سرزمین کے بجائے ملک شام کا سرسبز علاقہ مناسب ہوگا، کیونکہ عرب کے اکثر دیوتا ملک شام ہی کے باشندے تھے، ہیرودوٹس مورخ نے مسیحؑ سے چار سو برس پہلے عرب کے ایک دیوتا کا نام الیلات بتایا ہے، حالانکہ اس وقت قریش کا وجود بھی نہ تھا، اس لیے ان کی زبان کا لفظ بھی اس وقت موجود نہیں ہو سکتا، (ج ۲، ص ۲۲۷)

مارگولیتھ کی تحقیق یہ بھی ہے کہ لفظ اللہ اصل میں قریش کے خاندانی دیوتا کا نام تھا، اس لیے محمدؐ کی توحید پرستی کے یہ معنی ہیں کہ انھوں نے دوسرے قبائل کے دیوتاؤں کو مٹا کر اپنے خاندانی دیوتا کو منوایا (ج ۲، ص ۲۲۷) سید صاحبؒ اس کا جواب یہ دیتے ہیں:

"یورپ کے مشرقی تبحر علمی کی یہ شرمناک مثال ہے، سب سے پہلے سوال یہ ہے کہ اس عظیم الشان عربی زبان میں حقیقی خدا کے مفہوم کے لیے کوئی لفظ موجود نہ تھا، تم کہتے ہو کہ محمدؐ سے پہلے عرب میں موحدین موجود تھے' بہتر ہے، لیکن کیا وہ اپنے خدا کے لیے اللہ کے سوا کوئی اور لفظ پیش کرتے تھے؟ موجودہ عیسائی ادبائے عرب کے بیان کے مطابق عرب میں عیسائی شعراء بکثرت پیدا ہوئے ہیں، ہاں! سچ ہے عرب میں عیسائی شعراء

ہوئے ہیں، لیکن کیا ان کی زبان سے لفظ اللہ تم نے نہیں سنا؟ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی صفات خود مشرکین کے اقرار کے مطابق جو بیان کی ہیں وہ کیا کسی دیوتا پر صادق آسکتے ہیں؟ سب سے آخر یہ کہ اللہ کی اصل تو الالٰہ ہے، الٰہ تو صرف عربی میں نہیں بلکہ تمام سامی زبانوں میں خدا تعالیٰ ہی کے لیے مستعمل ہے، کم از کم الوہ اور الوہیم سے تو نا واقفیت نہ ہوگی، قریش اپنے دیوتاؤں کے مجسمے بنا کر پوجا کرتے تھے، کیا اس سب سے بڑے قریشی دیوتا کا بھی کہیں مجسمہ تھا؟ (ج۲، ص ۲۲۸)

ہالوے کا خیال تھا کہ حمیر قوم کا نام نہیں بلکہ قلعۂ شاہی کا نام تھا، رفتہ رفتہ اس نے حکومت کا اور پھر تمام قوم کا نام اختیار کر لیا، سید صاحب اس کو تسلیم نہیں کرتے، اس کے رد میں وہ لکھتے ہیں کہ لفظ مذکور اگر کسی مقام کا نام ہوتا تو اس کے پہلے لفظ ذو (مالک) یا لفظ حضر (شہر) یا لفظ بیت (قلعہ) آتا، جیسا کہ ذوریدان، ذو سلحین، حضر عدن، بیت ابین کے نام سے ظاہر ہے، یہ سب مقامات اور شہر کے نام ہیں، لیکن اس قسم کا لفظ حمیر کے ساتھ کہیں نظر نہیں آیا، مزید براں اب تک کتبات میں جس قدر شہروں اور قلعوں کے نام ملے ہیں وہ تمام تر عربی جغرافیوں میں مذکور ہیں، لیکن حمیر کا ذکر کہیں قلعہ یا شہر کی حیثیت سے نہیں (ج۱، ص ۲۷۵)

بعض یوروپین مصنفوں نے فاران کو جزیرہ نمائے سینا کے مغرب میں مصر سے متصل علاقہ قرار دیا ہے، بعض نے کوہ سینا کے دامن میں اس کو جگہ دی ہے، لیکن سید صاحبؒ اس کی تردید کرتے ہوئے توراۃ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ فاران سے مراد ملک حجاز ہی ہے، (ج۱، ص ۹۷) گذشتہ صفحہ میں اس کا ذکر آیا ہے کہ بعض یوروپین مصنفین میں بنو سام کے مسکن اول کے متعلق اختلاف ہے، کچھ ان کا مسکن افریقہ، کچھ آرمینیہ اور کردستان اور کچھ فرات بتاتے ہیں، لیکن سید صاحبؒ نے ان سب کی تردید کرتے ہوئے بڑے وثوق کے ساتھ بتایا ہے کہ ان کا پہلا مسکن عرب ہی تھا، (ج۱، ص ۱۱۵)

جرمن مستشرق اسپرنگر نے ۱۸۷۵ء میں قدیم جغرافیۂ عرب لکھی، اس میں بطلیموس کے جغرافیائی ناموں

کو صحیح ثابت کیا ہے، سید صاحبؒ نے جس طرح ریورنڈ فارسٹر سے اختلاف کیا، اسی طرح اسپرنگر کی تحقیق و تطبیق کو یہ کہہ کر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ قبائل عرب زیادہ تر بدویانہ زندگی کے عادی تھے، اس لیے ان کے مقامات کی تعیین نہایت مشکل ہے، پھر بطلیموس کی، قافلوں اور کاروانوں کی زبانوں سے ان کی تحقیق اور یونانی حرف و لہجہ میں ان کی تعبیر اور پھر انقلابات و حوادث روزگار کا تواتر، کاتبوں کی جہالت اور ناآشنائی فن ان وجوہ سے قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ ایک لفظ اپنے صحیح مخرج سے کہاں سے کہاں جا پڑا ہوگا، (ج۱، ص ۲۹ - ۲۸)

الفاظ کی لغوی تحقیق

سید صاحبؒ نے اپنی اس کتاب میں السنۃ العرب قبل الاسلام میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس کم عمری میں ماہر السنہ بھی ہو گئے تھے، اسی مہارت کی بنا پر انھوں نے اس میں بہت سے الفاظ کی لغوی تحقیق بڑی محنت سے کی ہے، ان کی آیندہ کی تصانیف میں بھی ان کا یہ وصف برابر ظاہر ہوتا رہا، وہ توجہ طلب الفاظ پر برابر رکتے ہیں، اور ان کی لغوی تصریح اور لسانی تشریح میں لذت محسوس کرتے ہیں، اس کی مثالیں سیرۃ النبیؐ میں بکثرت ملیں گی، اور ان کی نقوش سلیمانی میں ان کا یہ ذوق تو اپنے منتہا تک پہونچ گیا ہے، اس کتاب میں انھوں نے جن الفاظ کی لغوی تحقیقات کی ہے ان کے کچھ نمونے یہ ہیں، ہم ان ہی کے الفاظ میں ان کی تصریح کرتے ہیں:

سلاع: عرب کے ایک مشہور شہر کا نام، توراۃ میں سلاع آیا ہے، جو ادوم کی حکومت میں واقع تھا، سلاع کے معنی پتھر کے ہیں، عربوں کے ہاں اس کا نام الحجر ہے، اور یونانی میں اس کو پیٹرا کہتے ہیں، معنیً تینوں ایک لفظ ہیں۔ (ج۱، ص ۶۵ - ۶۴)

عاد: السنۂ سامیہ میں لٹریچر کے لحاظ سے عبرانی سب سے قدیم زبان ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قدیم الفاظ کی اصلیت عربی زبان سے زیادہ اس میں محفوظ ہے، لغوی حیثیت سے عربیہ میں عاد کے کوئی معنی نہیں، عبری میں عاد کی اصلیت موجود ہے، اس کے معنی بلند و مشہور کے ہیں، اور عجیب تر یہ کہ ارم اور رشم (سام) کے بھی یہی معنی ہیں، ان معنوں کا بقیہ اثر عربی میں بھی موجود ہے، ارم کے معنی پہاڑی اور نشان راہ کے پتھر کے

لغت میں مذکور ہیں، اور شم سے شمم اور سموتو اب تک مستعمل ہے، توراۃ میں عاد مذکر کے نام کے لیے اور عادہ عورتوں کے لیے کئی جگہ آیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عہد قدیم میں یہ نام عموماً مستعمل تھا، (ج ۱ ص ۱۳۰)

ثمود : ثمود کی لفظی تحقیق شاید عربی میں صحیح نہ مل سکے، ثمد عربی میں آب قلیل کو کہتے ہیں، لیکن اس سے کوئی خاص مناسبت نہیں معلوم ہوتی، عبری میں ایک لفظ تامید ہے، جس کے معنی دائم اور خالد کے ہیں، عربی کی "ش" اور عبری کی "ت" ایک چیز ہے، عبری میں ش نہیں ہے، اس لیے اکثر وہ الفاظ جو عربی میں "ش" سے ہیں، عبری میں "ت" سے ہیں، اس بنا پر ثمود کے معنی عام سامی زبان میں وہی ہوں گے جو عربی میں خالد کے معنی ہیں، اور بہت سے قبائل عرب کے نام ہیں، (ج ۱، ص ۱۸۶)

معین، معین بھی ایک قبیلہ تھا، اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ معین کے لفظی معنی منبع آب اور چشمہ کے ہیں، دیگر سامی زبانوں میں مثلاً عبری میں یہ لفظ معیان ہے، جو نہایت آسانی سے معان کی صورت میں بگاڑا جاسکتا ہے، جو اب تک شمالی عرب میں ایک آبادی ہے۔ (ج ۱، ص ۲۰۴)

یارح : یارح عبرانی ہے، عرب اس کو یعرب کہتے ہیں، السنۂ قدیم میں اس قسم کا تغیر لہجہ نہایت عام ہے، یہودی رواۃ عرب تمام قبائل یمن کو نہا یعرب کی اولاد قرار دیتے ہیں (ج ۱، ص ۲۲۵)

حضرموت : عبری زبان میں "ض" نہیں ہے، اس لیے حضرموت کا تلفظ اس میں حضرموت، یا حصارموت بہ زیادت الف ہے، حضرموت کی اولاد نے جس قطعۂ عرب کو اپنا مسکن بنایا وہ حضرموت کے نام سے آج تک مشہور ہے۔ (ج ۱، ص ۲۲۸)

تبع : لفظ تبع لغویین عرب کے نزدیک تبع یا تبعیت سے مشتق ہے، ممکن ہے کہ تبع عربی لفظ بمعنیٰ متبوع ہو، یعنی جس کی پیروی اور اطاعت لوگ کریں، لیکن تحقیق جدید یہ حبشی لفظ ہے، حبشی میں اس کے معنیٰ قادر، جبار اور صاحب قوت کے ہیں، حکومت اسلام میں ٹھیک اسی معنی میں لفظ سلطان (قوت و غلبہ) رواج پایا ہے، اس لفظ کے غیر عربی ہونے کی تائید علاوہ اس کے کہ حبشی زبان میں یہ لفظ موجود ہے یہ ہے کہ عربی زبان میں اس وزن پر کوئی لفظ واحد اور بمعنی مفعول نہیں آیا، رُکَّع، سُجَّد وغیرہ الفاظ تو جمع ہیں مبالغہ کا یہ وزن ہے تو وہ معنی مفعول نہیں پیدا کرتا، اور سب سے آخر اس کے غیر عربی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ عجمی ناموں کی طرح اس پر الف لام نہیں آتا، اگر یہ عربی صنف کا صیغہ ہوتا تو مانع الف ولام کیا ہے، لیکن یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ یہ صرف حبشی لفظ ہے، کتبات میں ملوک معین وسبا کے عہد میں یعنی کم از کم ہزار سال قبل مسیح میں تبع نظر آتا ہے، ایک بادشاہ معین کا نام تبع کرب بن تبع ایل مذکور ہے، ایک سبائی کتبہ میں تبع شمر جیل ملک سا منقوش دیکھا ہے، دوسرے کتبہ میں تبع کرب کا نصب شاہی نظر سے گذرا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسی معنی میں یہ لفظ اصلاً سبائی وحمیری ہے، (ج ۱ ص ۸۷ ـ ۲۸۴)

اصحاب الایکہ : قرآن مجید میں ایک قوم کا اصحاب الایکہ کے نام سے ذکر ہے، ایکہ کے لغوی معنی جنگل کے ہیں، اس قوم کے پیغمبر بھی حضرت شعیبؑ ہی تھے، بعض مفسرین کا خیال ہے کہ مدین اور اصحاب الایکہ ایک ہی چیز ہیں، ان کا قیاس ہے کہ ملک مدین کے پاس ایک جنگل تھا، جہاں مدین کی قوم کبھی کبھی قیام کرتی تھی، اس لیے اس کو اصحاب الایکہ، جنگل والوں کے نام سے خطاب کیا گیا۔ (ج ۲، ص ۳۱)

ہاجرہ : اصل میں عبرانی لفظ ہاغار ہے، جس کے معنی بیگانہ اور اجنبی کے ہیں (ج ۲، ص ۴۰)

اسماعیل : اسماعیل عربی میں شماع ایل ہے، شماع (سماع) سننا اور ایل (اللہ)، لفظی معنی خدا کا سننا ہے، خدا نے چونکہ ابراہیمؑ کی اولاد اور ہاجرہؑ کی فریاد سنی، اس لیے بچہ کا نام شماعیل پڑا، (ج ۲ ص ۴۲)

قیدار : قیدار حضرت اسماعیلؑ کے دوسرے بیٹے کا نام تھا، عبری میں قیدار کے معنی سیاہی اور غم کے ہیں، عربی میں بھی لفظ کدر و کدورت ہے، شاید حضرت اسماعیلؑ نے یہ نام باپ سے جدائی اور صحرا نوردی کے غم کی یادگار میں رکھا ہو۔ (ج ۲، ص ۹۰)

قریش : عربی میں قریش کے متعدد معنی ہیں، اس کا ایک ماخذ تقریش و تقرش ہے جس کے معنی اکتساب و تحصیل ہیں، خیال ہے کہ چونکہ اس خاندان کا اصلی پیشہ تجارت تھا، اس لیے قریش کے نام سے موسوم ہے، قریش

ایک دریائی درندہ جانور کا بھی نام ہے، جو دریائی جانوروں کا شکار کرتا ہے، اس قبیلہ کے سردار فہر نے اپنے استیلاء اور قوت کے اظہار کیلئے یہ لقب اختیار کیا، حضرت ابن عباسؓ نے اسی دوسری تاویل کو اختیار کیا ہے، (ج ۲، ص ۹۸ - ۹۷)

بعل: قریش کے مشترک خداؤں میں سے ایک کا نام تھا، جو دوسری سامی زبانوں میں بعل ہے اس کے معنی قوت اور تسلط کے ہیں، بعل کے دوسرے معنی قوی، سلطان اور مالک کے ہیں، عربی میں اسی سے بعل کے معنی شوہر کے ہیں، (ج ۲، ص ۱۵۵)

العزیٰ: یہ عز سے مشتق ہے، جس کے معنی غلبہ کے ہیں، عز کا اسم تفضیل مونث عزیٰ ہے، یعنی بہت غالب آنے والی دیوی، عجب نہیں کہ یہ قریش اور ان کے ہم نسب قبائل کی لڑائی کی دیوی ہو، (ج ۲، ص ۲۲۸)

مناۃ: اس لفظ کا اشتقاق چند ماخذوں سے ہو سکتا ہے، سب سے کمزور پہلو یہ ہے کہ وہ منی سے مشتق ہو، جس کے معنی بہانے کے ہیں، اسی سے مکہ کے مقام منیٰ کا نام ماخوذ ہے، یعنی خون بہانے کی جگہ ہے، مناۃ شاید قربانی کا دیوتا تھا، جس کے نام سے خون بہایا جاتا ہوگا، لیکن بجز قیاس کے اس اشتقاق کی صحت کی کوئی اور دلیل نہیں یاقوت نے اس کے مختلف اشتقاقات بتائے ہیں، ہمارے نزدیک ان میں سب سے صحیح یہ ہے کہ وہ منا سے مشتق ہے، اس کے معنی تقدیر کے ہیں، اور اس کے معنی ثانی موت کے ہیں، صاحب لسان العرب نے بتایا ہے کہ اس میں تہ حرف علامت تانیث کے لیے ہے، گویا مناۃ تقدیر اور موت کی دیوی تھی، نبطی کتبات میں بھی مناۃ منوت کی صورت میں ہے، قرآن مجید میں اس کا املا منوۃ ہے، (ج ۲، ص ۲۲۹)

ود: اس کے معنی محبت کے ہیں، اس کے مقابل دوسری دیوی نکرۃ تھی جس کے معنی ناپسندیدگی اور عداوت کے ہیں، (ج ۲، ص ۲۲۹)

سواع: اس لفظ کا مشتق منہ کلام عرب میں نہیں ملتا، ممکن ہے کہ سوع سے مشتق ہو جس کے معنی زمانہ کے ہیں، (ج ۲، ص ۲۲۹)

یعوق: عوق (روکنا) مضارع کا صیغہ ہے، اہل یمن میں یہ بت پوجا جاتا تھا، ان کے یہاں صیغۂ مضارع کو بطور علم استعمال کرنے کا خاص دستور تھا، چنانچہ یعرب، یشجب، یکرب، یعفر، یرعش، یہبن وغیرہ اصل نام کی ساتھ صفت کے طور پر مستعمل ہوتے ہیں، یعوق کے معنی روکتا ہے، یعنی مصیبتوں کو روکتا ہے (ج ۲ص ۲۲۹)

یغوث: یہ بھی یعوق کے قاعدہ سے علم ہے، غوث (فریاد کو پہونچنا) اس کا مصدر ہے، یغوث کے معنی فریاد رسی کرتا ہے، یغوث دیوتا کا نام کتبہ میں بھی ملتا ہے، (ج ۲، ص ۲۲۹)

نسر: اس کے لغوی معنی گدھ کے ہیں، اسی شکل کا ایک مجموعۂ کواکب آسمان میں ہے، جس کو نسر کہتے ہیں، نسر دیوتا کی حیثیت سے سامی قوموں میں بہت مدت سے پوجا جاتا تھا، اہل بابل کے دیوتاؤں میں ایک نسرک تھا، اس کا مجموعہ بھی پایا گیا ہے۔ (ج ۲، ص ۲۲۹)

تتمہ اوپر کی تفصیلات کو پڑھ کر ہمارے ناظرین گھبرا رہے ہوں گے، لیکن اس سے اندازہ ہوا ہوگا، کہ مولانا شبلیؒ نے اپنے شاگردوں کو جو نصیحت کی تھی کہ معلومات اور مواد کو ہر کونہ اور ہر گوشہ سے اس محنت سے ڈھونڈ کر پھر کوئی گوشہ خالی نہ رہ جائے، اس پر تاریخ ارض القرآن ہر طرح پوری اترتی ہے، مولانا شبلیؒ کی یہ نصیحت بھی تھی کہ جو کچھ لکھا جائے اس پر اگر کسی نے کچھ لکھا ہے تو اس سے بالکل الگ ہو، تاریخ ارض القرآن کے متعلق تو یہ کہنے میں تامل نہیں کہ وہ اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل ہی یگانہ اور منفرد ہے، اور پھر ابن خلکان کی اس بات پر بھی کہ جو چیز لکھی جائے بڑی محنت سے لکھی جائے، تاریخ ارض القرآن پوری اترتی ہے،

آخر میں یہ دیکھنا ہے کہ تاریخ ارض القرآن میں مولانا شبلیؒ کی یہ نصیحت کہاں تک پوری ہوتی ہے کہ معنی کے ساتھ عبارت کی چستی، طرز ادا کی شگفتگی، استعارات و تشبیہات کی ندرت ہو، یا ابن خلکان کا جو یہ بیان ہے کہ عبارت میں لطافت اور بیان میں حسن ہو، اس کی پابندی تاریخ ارض القرآن میں ہو سکی ہے کہ نہیں، شروع سے آخر تک اس کتاب کی زبان خالص تحقیقی ہے، اس کا موضوع ایسا ہی ہے کہ اس میں طرز ادا کی شگفتگی اور عبارت کی لطافت اور بیان کا حسن پیدا ہونا بہت مشکل تھا، یہ چیزیں ان کی آیندہ تصانیف خصوصاً

سیرۃ النبیؐ، خطبات مدراس اور نقوش سلیمانی میں تو خاص طور سے پائی جاتی ہیں لیکن تاریخ ارض القرآن میں اس کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

کچھ محققین ایسے ہوتے ہیں جو اپنی تحقیق کا احاطہ کرنے میں زبان کو قربان کر دیتے ہیں، اور کچھ اہل قلم ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی زبان کے حسن اور وقار کو برقرار رکھنے کی خاطر تحقیق کی زیادہ گہرائی اور گیرائی کو پسند نہیں کرتے، اس میں شک نہیں کہ سید صاحبؒ نے اپنی اس کتاب میں اپنی تحقیق و تدقیق کو زیادہ فوقیت اور اہمیت دی ہے، اس میں اپنی زبان اور اسلوب کے وہ جوہر نہیں دکھا سکے جو انھوں نے اپنی آیندہ تصانیف میں دکھایا ہے، مگر یہ اس کی مثال ہے کہ مشکل سے مشکل موضوعات پر تحقیق کرکے اردو زبان اور انداز بیان کو کیسے اس کا متحمل بنایا جاسکتا ہے۔

اس کے انداز بیان کی نشاندہی سید صاحبؒ ہی کی ایک تحریر سے کی جاسکتی ہے، انھوں نے یہ کتاب مولانا ابوالکلام آزادؒ کے ہفتہ وار الہلال سے علیحدہ ہونے کے بعد لکھی، وہ خود اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں کہ جب ۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنا اخبار الہلال نکالا تو میں اس کے اسٹاف میں شامل ہوگیا، اخبار کے لٹریچر اور ادبی سطح کو یکساں رکھنے کے لیے میں نے اس کے طرز میں لکھنا شروع کیا، چنانچہ الہلال میں اس زمانہ میں جو تحریریں میرے قلم سے نکلیں، ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کا طرز اتنا نمایاں ہے کہ لوگ غلط فہمی سے اس کو مولانا ابوالکلام کے نام سے بے تکلف چھاپ رہے اور پڑھ رہے ہیں، اور میری پہلی کتاب تاریخ ارض القرآن میں بہت کچھ مٹانے پر بھی اس کی جھلک موجود ہے۔ (معارف جولائی ۱۹۵۰ء)

ذرا اس جھلک کو تلاش کرنے کی کوشش کی جائے، مولانا ابوالکلام آزادؒ کے طرز بیان کی یہ خصوصیات ہیں کہ اس میں شوکت بیان اور جوش و خروش کا سیلاب امنڈتا چلا جاتا ہے، اس میں الفاظ کا شکوہ اور فقروں کی چمک دمک ہوتی ہے جس سے بڑی حرارت اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے، وہ اپنی تحریر کو قرآنی آیتوں سے سنوار کر کے پیرایۂ بیان کو بلیغ اور موثر بناتے ہیں، ان کی تحریروں میں بلاغت قرآنی کا اثر ہوتا ہے، ان کے

اسلوب میں شوکت اور عظمت ہوتی ہے، فوج در فوج الفاظ سے اپنی تحریروں میں رعد اور کڑک پیدا کر دیتے ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ بہت کچھ مٹانے پر بھی سید صاحبؒ کی تاریخ ارض القرآن میں الہلال کی کون سی جھلک موجود ہے، اس میں جوش و خروش اور شوکت و عظمت کا سیلاب تو نہیں امنڈتا دکھائی دیتا ہے، الفاظ کا شکوہ بھی نہیں، یا فوج در فوج الفاظ سے گرج اور کڑک بھی نہیں پیدا کی گئی ہے، ہاں اس میں قرآن کی آیتیں تو اس کثرت سے آئی ہیں کہ کبھی یہ شبہہ ہو جاتا ہے کہ یہ قرآنیات ہی کے سلسلہ کی کوئی کتاب ہے، اس کی تمہید ہی میں الہلال کا کچھ رنگ ضرور آگیا ہے جو ناظرین کی دسترس سے باہر ہے، ان کی خاطر اس کا اقتباس درج ذیل ہے:

"آج مسلمانوں کا وطن تمام دنیا ہے، تاہم مولد اسلام، موطن رسالت، مہبط قرآن دنیا کا صرف ایک ہی گوشہ ہے، یعنی عرب جس کو مادی زرخیزی کی محرومی نے گو بن کھیتی کا زمین اور وادی غیر ذی زرع کا خطاب دیا، لیکن جس کی روحانی سیر حاصلی کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ آج دنیا میں جہاں بھی روحانی کھیتی کا کوئی سرسبز قطعہ موجود ہے اسی کشت زار الٰہی کے آخری کسان کی تخم ریزی اور آب سیری کا نتیجہ ہے۔

اس مہبط وحی قرآنی اور موطن اول اسلام کی تقدیس اس بڑھے پیغمبر ابراہیمؑ کے نام سے ہے، جس نے اپنے بیٹے اسماعیلؑ کے خون سے اس بن کھیتی کی زمین کو سیراب کرنا چاہا، جس کی سیرابی گردن کے خون سے مقدر نہ تھی، بلکہ دل کے خون سے تھی، جب دل کا خون اس پر برسا تو یہ شور بے حاصل قطعہ حسب پیشین گوئی سابق لہلہا اٹھا:

ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ

پیروانِ محمدؐ کی مثال توراۃ اور انجیل میں یہ ہے کہ وہ ایک کھیتی ہے جس کا ڈنٹھل نکلا مضبوط ہوا، تنے پر کھڑا ہوا، کاشتکار دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، تاکہ کافر غم زدہ ہوں،

بِهِمُ الْكُفَّارَ (الفتح : ۴)

اس زمین کے اکثر حصے کی مادی تہوری دبے حاملی حکمت الٰہی کا مقتضا تھی کہ سلاطین عالم کے دست حرص و ہوس سے اس ارض مقدس کی عصمت مصون رہے، اور دست انسانی کے تمدن و صنعت کی سیاہی سے اس کی لوح سادہ پاک اور فطری رہے، تاکہ خود فطرۃ اللہ کا قلم صرف اپنے حروف و خطوط سے اس کی گل کاری کر سکے، اور خدا کی فطرت کا خزانہ جو اس کھنڈر میں دفن تھا، پیغمبر مذہب فطری کے وجود تک محفوظ رہے۔"

اب یہ ناظرین خود بھی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اوپر کے اقتباس میں الہلالیت کا رنگ آسکا ہے کہ نہیں، لیکن سید صاحبؒ جس سرزمین کا ذکر کر رہے تھے، اس سے ان کو کچھ ایسا عشق تھا کہ اس کے اظہار میں اس سے زیادہ موثر پیرایۂ بیان اختیار کرنا چاہتے ہوں گے، لیکن اتنا ہی کچھ لکھ کر قلم کو روک لیا۔

ایک اور اقتباس درج ذیل ہے، جس میں شاید وہ تاثیر اور حرارت نظر آئے جو الہلال میں پائی جاتی تھی، گو اس میں پرشکوہ الفاظ کی فراوانی نہیں، لیکن انداز بیان کی چمک دمک ضرور ہے :

"زمانہ جاہلیت میں ایسے متعدد شعراء گذرے ہیں جن کے کلام میں حق کی باتیں، الفاظ کی تاریکی میں ستاروں کی طرح چمکتی ہیں، مثلاً لبید (قبل اسلام) زہیر، امیہ بن الصلت، علاف بن شہاب التیمی، قس بن ساعد والایادی وغیرہ، شعراء کے کلام میں توحید، حشر و نشر اور محاسن اخلاق کی تعلیم ملتی ہے، آج کل کے بعض عرب عیسائی مصنفوں نے اس قسم کے عرب شاعروں کو عیسائی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے اپنی کوشش کی بنیاد ریت پر قائم کی اور ایک دلیل بھی دعوی کی استواری میں پیش نہ کر سکے، میرے خیال میں یہ شعراء حنفی العقائد تھے، چنانچہ ان میں سے بعض کے کلام میں اس کی تصریح بھی ملتی ہے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بعد کو بعض سادہ لوح مسلمانوں یا شریر لوگوں نے بہت سے جھوٹے شعر بنا کر ان لوگوں کی طرف منسوب کر دیے ہیں، قرآن کی آیتوں کی آیتیں لے کر ان کو موزوں کر کے

ان کے نام سے شعر کہہ دیے ہیں، آج کل کے عربی دان عیسائی ان اشعار کو بڑی چالاکی سے اس ثبوت میں پیش کرتے ہیں کہ دیکھو محمد (صلعم) نے شعرائے جاہلیت کے کلام کو الٹ پلٹ کر قرآن بنا دیا ہے، ان اشعار میں صحیح اور غلط، سچے اور جھوٹے کی تمیز صرف عربی زبان کے باریک بین اور نکتہ شناس ادیب ہی کر سکتے ہیں، جو جاہلیین اور مولدین کے کلام کو بیک وقت دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ ان میں موتی اور پوت کون ہے؟ (ج ۲، ص ۲۱۶)

اوپر کے اقتباس میں الہلال کا پورا رنگ نہ ہو، لیکن یہ تحریر اس کی ہے جو ایک خشک موضوع کی تحقیقات میں گم ہے، مگر اس کی انشا پردازی کی دبی ہوئی صلاحیت ابھرتی نظر آتی ہے، اوپر کے اقتباس میں ایک خاص قسم کی بے ساختگی، لطافت، چمک دمک، حرارت اور تاثیر تو ضرور پیدا ہو گئی ہے، اس آب و رنگ سے یہ غمازی ہوتی ہے، کہ آگے چل کر اس کی شجر کاری میں کیا کیا برگ و بار پیدا ہو کر رہیں گے۔

علمی حلقے میں یہ بات تعجب سے سنی جائے گی اگر یہاں پر یہ لکھا جائے کہ اس میں سید صاحبؒ بڑے نقاد بھی نظر آتے ہیں، اس میں ان کی تنقید نگاری کا وہ رنگ تو نہیں، جو موجودہ دور کے نقاد زلف مشکیں اور ساق سیمیں پر اشعار کہنے والے شاعروں پر تنقیدیں لکھ کر اپنی تحریروں کا جوہر دکھاتے ہیں، یا ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں پر اظہار رائے کر کے اپنی تنقید نگاری کی نکہت باد بہاری سے اپنے ناظرین کو خوش کرتے ہیں، لیکن اس میں ادبیات اسلامیہ میں تاریخ عرب، جغرافیۂ عرب، طوطمیت، ادبیات اسرائیلیہ، ادبیات یونان و رومانیہ، انکشافات اثریہ، تاریخ قدیم کے اصول کی تعیین پر جو نقد و تبصرہ ہے اس کی بالغ نظری پر تنقید نگاری کے فن کو ناز ہو سکتا ہے، سید صاحبؒ کی اس کاوش فکر پر ان کو نقاد کہا جائے تو موجودہ دور کے نقاد اپنے قلمرو میں اس کو شاید بے جا شبخون قرار دیں، اور اس کے لیے مخصوص اصطلاح وضع کر کے اپنے فن کی عصمت اور عفت کو مامون اور مصون کرنے کی کوشش کریں گے لیکن اہل نظر حقیقت کو حقیقت کہنے سے گریز نہ کریں گے۔

آخر میں یہ کہنا ہے کہ تاریخ ارض القرآن کو لکھے ہوئے تقریباً ستر برس ہو چکے ہیں، اس پر اب تک کسی قسم کی مخالفانہ تنقید یا تنقیص نہیں ہوئی ہے، شاید اس لیے کہ اس کا شروع سے آخر تک پڑھنا ہی صبر آزما ہے، پھر کس میں دم خم ہے جو اس کی عیب جوئی اور خردہ گیری کر کے اپنی ملمع کاری وقت نظر کا ثبوت دے، جس کو تحقیق و تدقیق سے دلچسپی نہیں اس کے لیے تو یہ کتاب طلسم ہوش ربا یا فسانۂ عجائب معلوم ہوگی، ہاں واقعی اگر کوئی علمی تلاش و جستجو اور تفحص کا دلدادہ ہے تو پھر یہ کتاب اس کے لیے نظر و فکر، دیدہ وری اور باریک بینی کا ایک خوان پر از نعمت ہے، اس میں تحقیق کو جو خلعت پہنایا گیا ہے، وہی اس کی اصل خوبی ہے۔

حضرت سید صاحبؒ کی یہ کتاب ۱۹۱۵ء میں لکھی گئی ہے، اس کو لکھے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا ہے، اس اثنار میں ضرورت تھی کہ اس موضوع پر اہل قلم اور صاحب تحقیق کچھ اور اضافہ کرتے لیکن یہ موضوع شاید اتنا خشک اور صبر آزما سمجھا گیا کہ اب تک اس موضوع پر اردو میں کسی نے لکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی، حالانکہ یورپ کے مستشرقین اس سلسلہ میں برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔

Land of The Bible پر کتابیں بہت کچھ لکھی گئی ہیں، اور لکھی جا رہی ہیں، لیکن اس موضوع پر ان کی تحقیقات زیادہ تر ظنیات اور قیاسات پر مبنی ہوتی ہیں اس لیے ان میں تغیر و تبدل اور ترمیم و اضافہ کی گنجائش تو رہتی ہے تاریخ ارض القرآن میں سید صاحبؒ نے جو کچھ کلام پاک کو ماخذ بنا کر لکھا ہے وہ تو حرف آخر ہے، آثار قدیمہ اور کتبات جو دریافت ہوتے رہتے ہیں ان کے ذریعہ سے معلومات میں مزید اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

وراقت: کتاب منزل بمنزل

از

مولانا محمد عبد الحلیم چشتی، کانو، نائیجریا

(۲)

اس کے علاوہ کتب فروش بھی کتابوں کی خرید و فروخت کے لیے مشرقی و مغربی ممالک میں گھومتے رہتے تھے، بعض اوقات صاحب کتب خانہ کسی ضرورت کے تحت اپنے ذخیرۂ کتب سے کتابیں ان کو بیچتے تھے[1]، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تاجر کتب جس طرح کتابیں کتب خانوں میں پہونچاتے تھے، اس طرح صاحب کتب خانہ سے کتابیں خریدا بھی کرتے تھے، یوں کتابوں کی گردش کا عمل جاری رہتا تھا۔

تاجر کتب نادر و اہم اور نئی نئی کتابیں بلاد مشرق (ایشیا و افریقہ) اور مغرب (یورپ) میں بھی لے جاتے، الکان کتب خانہ سے ربط و ضبط بڑھاتے اور انھیں کتابیں پہونچاتے تھے، چنانچہ حلب کا ایک تاجر کتب عراق سے بو علی سینا کی کتاب "القانون" کا نسخہ اندلس لایا، اس سے قبل یہ کتاب اندلس میں نہیں آئی تھی، اس نے ابو العلاء زہر بن عبد الملک اشبیلی متوفی ۵۲۵ھ کو دکھائی، مگر اس بالغ نظر کی نظر میں نہیں سمائی،[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے تاجران کتب کی تجارت کا دائرہ کتنی وسعت اختیار کر گیا تھا۔

اہل علم علماء سے کتابیں ہی نہیں خریدتے تھے، بلکہ ان کا ان سے سماع کرتے اور سند بھی لیتے تھے، چنانچہ

---

[1] عیون الانباء لابن ابی اصیبعہ ج ۳، ص ۱۷۴-۱۷۵ [2] ایضاً ص ۱۰۴-۱۰۵

ابو عبد اللہ محمد المعروف بہ ابن زوج الحرہ المتوفی ۴۲۳ھ سے خطیب بغدادی نے جو کتابیں خریدی تھیں ان کا بعض سے سماع بھی کیا تھا،[1] یہ عہد عباسی میں کتابوں کے استعمال کا شاہد عدل ہے۔

تجارت صرف تیار مال کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے یا ایک فرد و جماعت سے لے کر دوسرے فرد یا جماعت کو بیچنے ہی کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کے مفہوم میں لین دین کے اندر تعاون کے رشتہ کو استوار کرنا اور اس میں نظم و نسق قائم رکھنا بھی داخل ہے، یہ نظم اور انتظام و انصرام سرکار کی زیر سرپرستی ہو یا نہ ہو، وراقوں اور تاجروں کی برادری میں اس کا شعور ضرور تھا، یہ شعور ہی تھا جو بغداد کے سوق الوراقین سے اسپین تک بستی بستی میں کتابوں کو پھیلا رہا اور تجارت کتب کو فروغ دے رہا تھا، اس طرح ابلاغ و ترسیل کے عمل کو جاری رکھنے میں آسانیاں بہم پہونچ رہی تھیں۔

کتابوں کی قیمت پر کنٹرول عہد عباسی ہی میں نہیں بلکہ اس کے بعد کے دور میں بھی کتابوں کی قیمت کے بڑھنے اور گھٹنے پر نظر رکھی جاتی تھی، گو حکومت سرکاری طور پر کوئی اقدام نہیں کرتی تھی، لیکن صاحب تصانیف اس میں اخلاقی دباؤ ڈالتے تھے، اور اگر تاجران کتب نے کبھی کتابوں کی قیمت مناسب نہیں رکھی اور انھیں بیجا نفع اندوزی اور استحصال پر مصر ہوتے دیکھا گیا تو انھوں نے ایسی صورت میں اس کتاب کا بہتر بدل لانے کی کوشش کی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قیمت معمول پر آگئی،

شرح کتابت تیسری صدی ہجری کے اوائل میں عام طور پر وراق ایک درہم میں دس (۱۰) ورق لکھتا تھا، اور پانچ (۵) ورق فی درہم اجرت بہت گراں سمجھی جاتی اور گوارا نہیں کی جاتی تھی، چنانچہ فراء نے جب کتاب المعانی املا کرائی تو وراق پانچ ورق فی درہم پر نقل کرنے لگے، اس سے معلوم ہوا کہ اس نے انھیں بیجا نفع اندوزی سے روکا مگر یہ مانے، آخر اس نے کتاب المعانی کو شرح مزید کے ساتھ املا کرانا شروع کیا، ابھی سو (۱۰۰) ورق املا کرائے تھے کہ وراق دس (۱۰) ورق فی درہم پر راضی ہوگئے۔[2]

---

[1] تاریخ بغداد للخطیب ج۲، ص ۳۶۰-۳۶۱ [2] ایضاً ج۱۴ ص ۱۵۰۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء و ارباب فن علوم و فنون کی نشر و اشاعت، علم کی خدمت اور عوام کی سہولت کے پیش نظر کتابوں کی قیمت پر نظر رکھتے تھے، وراقوں اور تاجروں کو کتابوں کی معمول سے زیادہ قیمت وصول کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

تیسری صدی ہجری کے اواخر میں ایک جزء تین درہم میں لکھا جاتا تھا، چنانچہ ابو عتبہ احمد بن الفرج کندی حمصی المعروف بہ الحجازی المتوفی ۲۷۱ھ کے تذکرہ میں محمد بن عوف کا بیان ہے کہ میں نے ابوالیمان شعیب کی بے شمار کتابیں نقل کی تھیں، میں ایک جزء تین (۳) درہم میں لکھتا تھا۔[1]

تیسری صدی ہجری کے اواخر میں ایک جزء ایک درہم میں فروخت ہونے لگا تھا، ابراہیم حربی (۱۸۵ھ - ۲۸۵ھ = ۸۱۵ء - ۸۹۸ء) سے ان کی دختر نے تنگدستی کی شکایت کی، انھوں نے اس سے یہی کہا تھا کہ جس کے پاس بارہ ہزار جزء لغت کے موجود ہوں اس کے پاس بارہ (۱۲) ہزار درہم ہیں، وہ فقیر نہیں ہوتا، میرے مرنے کے بعد ہر جزء ایک درہم میں بیچ سکتی ہو،[2] جزء کی مقدار ہر دور میں تقریباً مختلف رہی ہے، لیکن تیسری صدی ہجری میں پچاس (۵۰) ورق کی کتاب کو لفظ جزء سے تعبیر کیا جاتا تھا، چنانچہ مورخ کا بیان ہے ابو محلم بغدادی نے مجھ سے ایک جزء مستعار لیا تھا جو تقریباً پچاس ورق پر مشتمل تھا،[3] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تیسری صدی ہجری کے اواخر میں بارہ ورق فی درہم اجرت نقل تھی، چنانچہ ابو بکر محمد بن مسلم بن عبد اللہ قنطری زاہد المتوفی ۲۶۰ھ جامع سفیان ثوری کا نسخہ تیرہ (۱۳) درہم میں لکھتے تھے،[4] بعض خاص اسباب کے تحت بعد کے ادوار میں بھی جزء اسی حساب سے فروخت ہوا، چنانچہ چھٹی صدی ہجری میں اسعد بن الیاس المتوفی ۵۵۷ھ کے تیار کیے ہوئے خلاصے بولی لگنے پر ایک درہم فی جزء کے حساب سے بکے تھے،[5] تاہم نامور مصنف کا اپنا لکھا ہوا ایک جزء تقریباً ایک دینار میں بکتا تھا، چنانچہ خلیل بصری کی کتاب العین، جو

---

[1] تاریخ بغداد للخطیب ج۴، ص ۳۴۱۔ [2] ایضاً ج۶، ص ۳۳ [3] الفہرست لابن الندیم ص ۶۹، [4] تاریخ بغداد ج۳، ص ۲۵۶ [5] عیون الانباء لابن ابی اصیبعہ ج۲ ص ۲۹۳۔

اڑتالیس جزء میں تھی پچاس[۵۰] دینار میں فروخت ہوئی تھی[۱]۔

مدینۃ السلام بغداد میں کتابت مذکورۂ بالا اجرت پر کی جاتی تھی، لیکن دیگر اسلامی ممالک میں بعض وجوہ سے کتابت کا نرخ مختلف تھا، چنانچہ بعض اوقات شناسان کتب کو اجرت کتابت زیادہ ادا کی جاتی، چنانچہ تیسری صدی ہجری کے نصف میں ابوزرعہ رازی نے مصر میں جب امام شافعیؒ کی تصانیف نقل کرائیں تو تقریباً اجرت کتابت فی کاغذ ایک درہم ادا کی تھی، موصوف کا بیان ہے :

میں ۲۳۲ھ میں حج کرتے ہوئے مصر کی طرف نکلا، وہاں ٹھہرنے کا بہت کم خیال تھا، لیکن علم و استفادہ کا یہاں زیادہ چلن دیکھا تو پندرہ مہینے ٹھہرا، امام شافعیؒ کی کتابوں کے سب سے زیادہ واقف کو ڈھونڈا تاکہ ان کا ذخیرۂ کتب نقل کرایا جائے، اس نے اسی درہم اجرت مانگی، میرے پاس دیباکے دو[۲] کپڑے تھے، میں نے انھیں ساٹھ[۶۰] درہم میں بیچا، دس درہم میں سو ورق کاغذ خرید کر اسے دیا، کتابیں نقل کرائیں[۲]۔

اس سے معلوم ہوا کہ تیسری صدی ہجری میں کہ ایک امام مجتہد کی تالیفات کا ذخیرہ نوے درہم میں فراہم کیا جاسکتا تھا۔

عہد عباسی میں جوں جوں معیار زندگی بلند ہوتا گیا، اسی لیے صرف کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہوا، اور وراقت وکتابت بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں، چنانچہ چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں تقریباً ایک ورق ایک درہم میں لکھا جاتا تھا، مشہور ادیب و قاضی ابوسعید سیرافی المتوفی ۳۶۸ھ مجلس قضا و درس سے قبل ہر روز دس ورق جس کی اجرت دس درہم تھی لکھ کر اٹھتے تھے[۳]، اور ابوعلی حسن عسکری المتوفی ۴۲۵ھ پانچ درہم کا کاغذ خریدتے جو اتنا ہوتا تھا کہ اس میں متنبی کا دیوان لکھ لیا جاتا تھا، (اور متوسط قلم سے موجودہ متوسط تقطیع کے تقریباً تین سو صفحات) وہ لکھنے کے بعد کم از کم ڈیڑھ سو درہم ورنہ عموماً دو سو[۲۰۰] درہم میں فروخت کرتے تھے، موصوف زود نویس تھے، تین[۳]

۱؎ الفہرست لابن الندیم ص ۶۴ ۲؎ ابن ابی حاتم، کتاب تقدمۃ الجرح والتعدیل ص ۳۴۰ ۳؎ نزہۃ الادباء لابن الانباری ص ۳۷۹، انباہ الرواۃ للقفطی ج ۱ ص ۳۱۳ - ۳۱۴، الجواہر المضیئہ للقرشی ج ۱ ص ۱۹۶، ج ۲ ص ۲۲۶ ابن خلکان ج ۱ ص ۱۳۰ و لسان المیزان لابن حجر ج ۲ ص ۲۱۸۔

دن میں ایک دیوان لکھتے تھے جو زود نویس نہ ہوتا، وہ ہفتہ میں لکھ لیتا تھا، اس سے عسکری نے پچیس[۲۵] ہزار درہم کمائے تھے[۱]، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زود نویس کاتب تقریباً پچاس[۵۰] درہم یومیہ اور غیر زود نویس کاتب پچیس[۲۵] درہم یومیہ سے زیادہ پیدا کرتا تھا، اس سے وراقت، کتابت کے پیشے میں کمائی کا وراقوں اور کاتبوں کی خوشحالی اور ان کے معیار زندگی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

کتابوں کی قیمت کا ضروریات زندگی سے موازنہ

عہد عباسی میں کتابوں کا ذخیرہ بڑھانے اور کتب خانہ بنانے پر جو رقم خرچ کی جاتی تھی وہ ضروریات زندگی کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتی تھی،

اس کا اندازہ حسب ذیل واقعہ سے کیا جاسکتا ہے، مشہور محدث شعبہ ابن الحجاج (۸۲ھ/۷۰۱ء، ۱۶۰ھ/۷۷۶ء) کے مرنے کے بعد ان کے خچر، زین، لگام، بدن کے کپڑے اور جوتے سولہ درہم میں بکے تھے[۱]۔

اس سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ اس زمانہ میں خچر، اس کا ساز و سامان، سوار کا جوڑا اور جوتا سولہ درہم میں آتا تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابتدا میں عہد عباسی میں عام پڑھے لکھے انسان کی ضروریات زندگی کی تکمیل اس معمولی رقم سے پوری ہو جاتی تھیں، اس لیے کہ اس دور میں خچر پانچ درہم میں، سستی قمیص چار درہم میں اور عمدہ قمیص آٹھ درہم میں ملتی تھی[۲]، ایک امام فن (جیسے امام محمدؒ) کی تصانیف پر ساٹھ[۶۰] دینار خرچ آتا تھا[۳]،

مذکورۂ بالا تاریخی شہادت اس امر کا نہایت بین ثبوت ہے کہ عہد عباسی میں اہل علم شائقین کتب سب سے زیادہ رقم کتب و کتب خانوں پر خرچ کرتے تھے، جو ان کی علمی و مادی ثروت کی شاہد عدل ہے۔

گراں قیمت کتابوں کے عوامل

عہد عباسی میں اسلامی قلمی کتابیں عام نرخ پر ملتی تھیں، لیکن حسب ذیل خصوصیات سے آراستہ کتابیں صحت و ندرت کی وجہ سے عام طور پر گراں قیمت میں دستیاب ہوتی تھیں۔

۱؎ تاریخ بغداد ج ۷، ص ۳۱۹ - ۳۲۰، الانساب للسمعانی، ورق ۳۹۵ ۲؎ ایضاً ج ۹، ص ۲۶۲ ۳؎ ایضاً ج ۹ ص ۳۶۱، ۲؎ تقدمۃ الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم الرازی، ج ۱، ص ۱۶۳، توالی التاسیس لابن حجر ص ۷۶۔

(١) مصنف یا شارح کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب، چنانچہ خلیل بصری کی کتاب العین جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ مصنف کا اپنا نسخہ تھا، پچاس[۵۰] دینار میں بکا تھا[۱]

(الف) مصنف یا شارح یا ترجمہ نگار کا اپنا لکھا ہوا نسخہ۔

(ب) " " " کا صحت کردہ نسخہ۔

(ج) " " " کے تلمیذ خاص کا نسخہ[۲]

(د) " " " کا صحیح کیا ہوا یا اس سے پڑھا ہوا نسخہ۔

(ہ) " " " کے وراق کا لکھا ہوا نسخہ۔

(و) " " " کے نسخہ سے منقول و مقابلہ کیا ہوا نسخہ۔

(ز) " " " کی آخری عمر کا نسخہ۔ (بشرطیکہ حافظہ درست رہا ہو)

(خ) " " " سے قریب العہد نسخہ۔

(٢) اہل علم کا تصحیح کیا ہوا نسخہ[۳]

(٣) نامور وراق کا لکھا ہوا نسخہ۔

(۴) عالم یا علماء کے زیر مطالعہ رہا ہوا نسخہ۔

(۵) نامور عالم یا علماء کے حواشی سے آراستہ نسخہ[۴]

(٦) مشہور صحیح نویس کا لکھا ہوا نسخہ جیسے یوسف بن خوز النجیرمی المتوفی ۴۲۳ھ کا لکھا ہوا دیوان جریر اور طبقات الشعراء ابن سلام میں سے ہر ایک مصر میں بیس دینار میں فروخت ہوتا تھا[۵]

(٧) نامور خطاط کا لکھا ہوا نسخہ۔

---

[۱] الفہرست لابن الندیم ص ۴۲ [۲] مناہج العلماء فی البحث العلمی، ص ٦٣ - ٦۴ [۳] ایضاً [۴] ایضاً [۵] انباء الرواۃ للقفطی ج ۲، ص ٦٧۔

(٨) عمدہ کاغذ پر خوشخط لکھا ہوا نسخہ۔

(٩) کسی وزیر، امیر کبیر، عالم یا بادشاہ یا بزرگ کے خزائن کتب کا نسخہ[۱] اکثر شاہی کتب خانوں کی کتابوں پر "برسم خزانۃ الملک" کے الفاظ لکھے ہوتے تھے[۲] یا کسی وزیر، امیر یا بزرگ کا یا کسی کے کتب خانے کی کتابوں پر ان کا نام لکھا ہوتا تھا۔

(١٠) بادشاہ، وزیر، عالم اور صاحب فن میں سے کسی کے نام معنون کیا ہوا نسخہ۔

(١١) ان مذکورۂ بالا شخصیات میں سے کسی کے لیے تیار کیا ہوا یا کرایا ہوا نسخہ۔

(١٢) کسی کتاب کا مشکول (اعراب لگا یا ہوا) نسخہ۔

(١٣) نقش و نگار سے آراستہ کتاب، مطلا و مذہب نسخہ۔

(١۴) خوشنما مجلد نسخہ[۳]

(١۵) مصور نسخہ[۴]

(١٦) امہات الکتب، ہر فن کی امہات الکتب بھی گراں قیمت میں دستیاب ہوتی تھیں۔

(١٧) فنی کتابیں، چنانچہ بطلیموس کی فن ہیئت میں مشہور کتاب المجسطی کا نسخہ چوتھی صدی ہجری میں بیس[۲۰] دینار میں فروخت ہوا تھا[۵] یا مثلاً ابو علی ابن الہیثم بصری المتوفی ۴۳۰ھ کی نقل کردہ اقلیدس، کتاب المتوسطات اور کتاب المجسطی کا نسخہ ڈیڑھ سو دینار سے کم میں فروخت نہیں ہوتا تھا[٦]

(١٨) دائرۃ المعارف کی قسم کی کتابیں چنانچہ ابو نعیم اصفہانی کی کتاب الحلیہ (جو تصوف کا دائرۃ المعارف ہے) ان کی حیات میں نیشاپور پہونچی تو چار سو دینار میں بکی تھی[٧]

---

[۱] الفہرست لابن الندیم ص ۴۳ [۲] ایرج افشار، نسخ خطی اسلامی و سابقۂ تاریخ آنہا، ہنر و مردم شمارہ ١١٢ (اذر ماہ ١٣۵١ ہش) ص ۳
[۳] نفح الطیب للمقری ج ۲ ص ١٠١ [۴] معجم الادباء ج ٦ ص ١۴٧ - ١۴٨ [۵] مصطفے جواد، الثقافۃ العقلیۃ والحالۃ الاجتماعیۃ فی عصر الشیخ ابو علی بن سینا، مجلۃ المجمع العلمی العراقی ج ۴، شمارہ ۴، شمارہ ١٠١ (۱۳۷۵ھ) ص ۵٠٢ [٦] عیون الانباء لابن ابی اصیبعہ ج ۲ ص ١۵٠
[٧] تذکرۃ الحفاظ للذہبی ج ۲، ص ١٠٩۲۔

(۱۹) غیر زبانوں سے ترجمہ شدہ کتابیں، اس قسم کی کتابوں کی قیمت عربی کتب کی نسبت زیادہ ہوتی تھی ہاتھوں ہاتھ نکلتی اور مملکتوں میں تاجروں کے ذریعہ دور دور تک پہونچ جاتی تھیں[1]۔

(۲۰) وہ کتابیں جن کا چلن کم ہوتا یا جن کی طرف اہل علم کی رغبت کم ہوتی تھی، وہ بھی گراں ملتی تھیں۔

(۲۱) کسی کتاب کا پہلا نسخہ جب کسی دیار میں پہونچتا وہ بعض اوقات بہت گراں قیمت میں بکتا، چنانچہ عبداللہ ابن عبدالرحمن ابی زید قیروانی المتوفی ۳۸۶ھ / ۹۹۶ء کا الرسالہ جو مالکی فقہ کے چار ہزار مسائل اور چار سو حدیثوں پر مشتمل مختصر و مقبول رسالہ ہے[2]، جب افریقہ سے ایشیا آیا اور مرکز خلافت بغداد پہونچا تو فقیہ ابوبکر محمد بن عبداللہ ابہری المتوفی ۳۷۵ھ / ۹۸۶ء کے حلقۂ درس میں اسے بیس[3] دینار میں خریدا گیا تھا[4]۔

قلمی کتابوں کی اہمیت و ندرت یا چلن یا رغبت کم ہونے کی وجہ سے گراں قیمت ہونے کے یہ وہ عوامل ہیں جو عہد عباسی میں کارفرما تھے، کم و بیش آج بھی ان پر عمل کیا جاتا ہے، اور یہی وہ اساسی اصول ہیں جن کو مسلمانوں نے قلمی نسخوں کی علمی تحقیقات میں بنیاد بنایا، ان کے قیمتی اصول آج بھی تحقیق متون میں ملحوظ رکھے جاتے ہیں، اور کتب خانوں کی عظمت و شہرت کا باعث ہیں، ان اصول سے ابن الندیم کی کتاب الفہرست میں اعتنا کیا گیا ہے، البتہ تاریخ کتب خانہ میں ہم نے استقراء و تتبع سے پہلی مرتبہ ان کا احاطہ اور انھیں مرتب و یکجا کیا ہے۔

سستی کتابوں کے عوامل | کتابیں عام طور پر مروجہ نرخ پر ملتی تھیں لیکن بعض اوقات حسب ذیل اسباب کی وجہ سے کتابیں سستی بھی مل جاتی تھیں۔

(۱) جب حملہ ہوتا اور فوج کشی سے تباہی آتی، مدرسے، کتب خانے اور علمی خانوادے برباد ہوتے، وزیروں، امیروں کے محلات لٹتے اوباش کتابیں لے جاتے اور انھیں کوڑیوں کے مول بیچتے تھے۔

---

[1] الفہرست لابن الندیم ص ۳۶۱ [2] عمر الجیدی، نظرات فی تاریخ المذہب المالکی من اوائل المصنفات فی المذہب المالکی من اوائل المصنفات فی المذہب المالکی الرسالہ: دعوۃ الحق، شمارہ ۲۲۸ جمادی و رجب ۱۴۰۳ھ ص ۱۷ [3] عبدالرحمن بن محمد الدباغ، معالم الاعیان فی معرفۃ اہل القیروان تونس ۱۳۲۰ھ ج ۳ ص ۱۲۷ [4] ایضاً عمر الجیدی من اوائل المصنفات فی المذہب المالکی الرسالۃ دعوۃ الحق ص ۱۷۔

۵۹۸ھ میں عراق پر حملہ ہوا تو نیم دانگ[1] میں ایک من کتابیں تول کے حساب سے بکی تھیں[2]۔

(۲) کبھی ناواقف لوگ فی الفور اپنی ضرورت کے لیے کتاب سستی بیچتے اور خریدار بلا طلب سستے داموں خرید لیتے تھے، ابن سینا کو ایک ضرورت مند سے بلا طلب ابونصر فارابی کی کتاب ما بعد الطبیعیہ اسی طرح کوڑیوں میں ہاتھ آئی تھی[3]۔

(۳) جب کوئی عالم مرتا اس کے ذخیرۂ کتب میں کتابیں نسبۃً سستی فروخت ہوتی تھیں، اس لیے اہل علم گنجائش نہ ہونے کے باوجود زیادہ تعداد میں کتابیں خریدتے تھے، چنانچہ ابن طرخان کے ترکہ سے ابوحیان توحیدی نے ۳۷۰ھ میں بہت سی کتابیں خریدی تھیں[4]۔

(۴) ناقص اور عیب دار کتابیں سستی فروخت ہوتی تھیں، کتابوں کے شوقین بعض نادار یا بخیل یا عیار و کتاب شناس شوقین عالم جب کتابوں کے ڈھیر سے کوئی کتاب نکالتے موراق اس کتاب کی اہمیت و ندرت کو پالیتا اور اسی لحاظ سے وہ کتاب کے دام مانگتا تھا، مگر یہ کتابیں سستی خریدنے کی غرض سے غیر اخلاقی حرکت سے بھی گریز نہیں کرتے تھے، کتاب دیکھتے دیکھتے اس کو پھاڑ دیتے اور ورق نکال لیتے، اور کسی نہ کسی طرح کتاب میں نقص پیدا کرکے اسے کم قیمت میں خرید لیتے تھے، چنانچہ مشہور نحوی ابن الخشاب المتوفی ۵۶۷ھ اسی طرح کتاب خریدتا تھا[5]، ابوالخیر مسیحی ابن ابی البقاء المتوفی ۶۰۸ھ کا بھی یہی وطیرہ تھا[6]۔

(۵) شریف خاندان کی بعض مصیبت زدہ خواتین اپنا بھرم قائم رکھنے اور ضروریات زندگی پوری کرنے اور بدنامی سے بچنے کی خاطر خاندانی ذخیرے چوری چھپے اونے پونے بکواتی تھیں، اس طرح لوگوں کو سستی کتابیں مل جاتی تھیں، چنانچہ ہندو شاہ نخجوانی کا بیان ہے کہ ایک عورت اوراق و کراریس اور بڑے کاغذات کا پلندہ

---

[1] دانگ، دانق کا معرب ہے یہ چھ رتی وزنی چاندی کا سکہ تھا [2] راحۃ الصدور و آیۃ السرور، تالیف محمد بن علی الراوندی، تحقیق محمد اقبال ولیڈن ای. جی. بریل ۱۹۲۱ء ص ۳۳ [3] انباہ الرواۃ للقفطی ص ۲۱۵ ۔ ۲۱۶ [4] اخلاق الوزیرین مثالب الوزیرین اخلاق الصاحب ابن عباد و ابن العمید لابی حیان التوحیدی تحقیق ابراہیم کیلانی دمشق، دار الفکر ۱۹۶۱ء ص ۵۲۱ [5] معجم الادباء ج ۴ ص ۲۸۰ - ۲۸۶ [6] اخبار الحکماء للقفطی ص ۳۳۲ - ۳۳۳۔

بیچنے کے لیے میرے پاس لائی، بہت سستا دے گئی، میں نے اسے کھول کر دیکھا تو اس میں ابن مقلہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک دفتر تھا[1]۔

(۶) بعض وہ لوگ جو زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہوتے انھیں ترکہ میں کتابیں ملتی تھیں، یہ کھڑے کھڑے سوق الوراقین میں دلالوں سے بولی لگوا کر کتابیں نکال دیتے تھے، اس قسم کی کتابیں بھی سستی مل جاتی تھیں[2]۔

(۷) کال (قحط) پڑتا، اور لوگوں کے پاس کھانے کو نہیں رہتا تو بھی لوگ کتابیں سستی بیچ کر پیٹ کی آگ بجھاتے تھے۔

تاتاریوں نے بغداد کو تباہ کیا، اہل بغداد دانے دانے کو ترس گئے، اہل حلہ اور اہل کوفہ بغداد میں کھانے کا سامان لاکر بیچتے، اور اس کے عوض قیمتی کتابیں بہت ہی سستی خرید کر لے جاتے، اس طرح ذخیرہ اندوزی سے وہ بہت جلد مالدار بن بیٹھے تھے[3]، گویا قحط سالی نے زرعی معیشت کے کارکنوں (کسانوں) کے گھروں میں بھی کتابیں پہونچادی تھیں۔

کتابوں کے سستا ہونے کے مذکورۂ بالا عوامل آج بھی اسی طرح کارفرما ہیں جس طرح عہد عباسی میں کارفرما تھے۔

---

[1] تجارب السلف در تواریخ خلفا و وزرائے ایشان، از ہندو شاہ نخجوانی، تہران، مطبعہ فردین ۱۳۱۳ھ ص ۲۶۲، [2] اخبار الحکماء ص ۳۱۵ - ۳۱۶۔ [3] الحوادث الجامعہ والتجارب النافعہ لابن الفوطی، بغداد، المکتبۃ العربیۃ ۱۳۵۱ھ ص ۳۳۱۔

آثارِ علمیّہ

گذارش احوال واقعی

از جناب شیخ نذیر حسین صاحب، مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

معارف میں تین ساڑھے تین سال سے مستشرقوں پر نہ ختم ہونے والا سلسلۂ مضامین جاری ہے، ان مضامین میں بیشتر مقالہ نگاروں نے وہی باتیں دہرائی ہیں جو آج سے ساٹھ ستر برس پیشتر مولانا شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ نے لکھی تھیں، انھوں نے کوئی نئی بات نہیں لکھی، بعض مقالہ پیش کرنے والوں نے ایک مصنف کی ایک ہی کتاب پر بحث و استدلال کی عمارت کھڑی کر دی ہے، ان سب کا قدر مشترک مستشرقوں کا تعصب اور اسلام دشمنی ہے، میرا گمان یہ ہے کہ ان فاضل مقالہ نگاروں کی اکثریت مستشرقوں کی تصحیح سے شایع شدہ کتابوں کی اہمیت اور دوسری خدمات سے ناواقف ہے، کاش کہ انھوں نے معجم البلدان (یاقوت) اور تاریخ الطبری کے یورپی ایڈیشنوں کے صرف انڈکس اور فرہنگ دیکھ لیے ہوتے۔

مستشرقوں کی تنگ نظری اور بعضوں کے تعصب کا مجھ کو بھی اقرار ہے، ان کے بعض افکار و نظریات سے شدید اختلاف بھی ہے، لیکن ایک بات عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ ان کی علمی کاوشوں کا بھی خوشدلی سے اعتراف کیا جائے، ڈچ اور جرمن مستشرقوں نے ہمارے علمی ورثے کو زندہ کیا ہے اور اس کو نئی آب و تاب سے پیش کیا ہے، ان میں ڈوزی، ڈخویہ، وسٹنفیلڈ، اور براکلمان کی علمی خدمات کی قدر و قیمت سے آنکھیں بند کر لینا بے خبری، بے ذوقی اور کم نگاہی کی دلیل ہے، خدارا مجھے بتلایا جائے کہ عربی زبان و ادب کا ایک طالب علم لین (Lane) کی عربی، انگریزی لغت اور براکلمان کی تاریخ ادب عربی سے کیسے بے نیاز رہ سکتا ہے۔

ان بدنام مستشرقوں نے ہمیں تاریخ ادب کا نیا مضمون دیا ہے، تاریخ ادبیات میں نثر نگاری کو شعر و شاعری کے

برابر درجہ دیا ہے، کتابوں میں مذکورہ اسماء اور اعلام کے انڈکس کو رواج دیا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ کے شہر اور (۴ ما) کا پتہ چلایا ہے، اصحاب کہف کے مدفن اور خانقاہ کا سراغ لگایا ہے، اور سندھ میں محمد بن قاسم کے بسائے ہوئے شہر منصورہ کے آثار دریافت کیے ہیں، برطانیہ کی وزارت بحریہ نے ۱۹۱۷ء میں جزیرۂ عرب کے جغرافیہ اور طبعی حالات پر ایک کتاب شایع کی تھی جس کی افادیت ساٹھ ستر برس گذرنے کے باوجود آج بھی قائم ہے۔

ہندوستان میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے ہندوستان کی فارسی کتب تاریخ کو بڑے اہتمام سے شایع کیا ہے، ان کے علاوہ زمخشری کی تفسیر الکشاف، تھانوی کی کشاف اصطلاحات الفنون، الاصابہ، دیوان الحماسۃ الفیہ کی شروح اور ہدایہ کا انگریزی ترجمہ، مشرقی علوم کے شایق انگریز حکام کی سرپرستی میں کلکتہ سے شایع ہوا تھا، ابوالفضل کی آئین اکبری ہندی، اسلامی ثقافت کا انسائیکلوپیڈیا ہے، بلاخ مین[1] (Blochmann) کے قلم سے اس کا انگریزی ترجمہ صحت بیان اور خوبیٔ زبان کے اعتبار سے ہر طرح قابل تحسین ہے۔

ہندوستان میں پرانے انگریز آئی سی ایس افسروں نے اس زمانہ میں گھوڑوں، خچروں اور اونٹوں پر سفر کر کے مختلف اضلاع کے گزٹیر اور مالگذاری اور بندوبست کی رپورٹیں مرتب کیں، جب ذرایع سفر محدود و مخدوش اور تمدنی زندگی کی موجودہ آسائشیں مفقود تھیں، یہ رپورٹیں آج بھی کارآمد ہیں، مختلف صوبائی زبانوں کی گرامریں اور لغات بھی ان کے علمی شوق کی یادگار ہیں۔

ان سطور کے لکھنے سے غرض مقصود تصویر کا صرف دوسرا رخ پیش کرنا ہے، کسی کی بے جا مدح اور حمایت و مدافعت منظور نہیں۔

بزم نشینانِ معارف سے صرف اتنی گذارش ہے کہ وہ مستشرقوں کے تعصب اور اسلام دشمنی کا پردہ ضرور چاک کریں، ان کی پھیلائی ہوئی غلطیوں کی شوق سے تردید کر دیں لیکن ساتھ ہی ان کی علمی خدمات کو بھی سرسری نظر سے دیکھ لیا کریں، کسی کی تغلیط اور تردید کے ساتھ اس جیسا کام بھی کر کے دکھائیں اور مرض کی تشخیص کرتے ہوئے اس کا علاج و مداوا بھی پیش کریں۔

---

[1] سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ۔

بابُ التقریظ والانتقاد

زندہ رود کی تیسری جلد

از سید صباح الدین عبد الرحمن

جناب ڈاکٹر جاوید اقبال (چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ) کی زندہ رود کی تیسری جلد زیر نظر ہے، جو ان کے والد بزرگوار علامہ محمد اقبالؒ کی سوانح عمری کے زریں سلسلہ کی آخری کڑی ہے، اس سے پہلے جون ۱۹۸۰ء کے معارف میں اس کی پہلی جلد اور جنوری ۱۹۸۳ء میں اس کی دوسری جلد کا طویل ذکر آچکا ہے، پہلے بھی اس کی اہمیت یہ لکھ کر ظاہر کی گئی تھی کہ یہ ایک باپ کی کہانی بیٹے کی زبانی ہے، انیسویں اور بیسویں صدی میں جو ارباب کمال مسلمانوں کی زندگی کے معمار ہے ان میں سے کسی کے فرزند ارجمند کو اپنے والد بزرگوار کی سوانح عمری لکھنے کی سعادت اور توفیق نہیں ہوئی، علامہ محمد اقبالؒ اس حیثیت سے خوش نصیب باپ ہیں کہ ان کے لایق فرزند نے ان کی سوانح عمری لکھ کر نہ صرف ان کی روح کو خوش کیا، بلکہ ان کی ملت کو ایک بیش بہا اور دل نواز تحفہ پیش کیا، یہ وہی جاوید اقبال ہیں جن کو مخاطب کر کے ان کے والد بزرگوار نے کہا تھا

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو، سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
میں شاخ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

یہ تینوں جلدیں لکھ کر اس کے مصنف نے دلِ فطرت شناس کا ثبوت دیا ہے، اور اپنے والد بزرگوار کی

زندگی کے سکوتِ لالہ وگل سے ہم کلام ہوکر اور ان کے خیالات کی شاخِ تاک اور ان کے افکار کی غزل کے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر دیا ہے،

علامہ کے حالات بہت کچھ لکھے جا چکے ہیں، اور ان کے شاعرانہ کمالات اور افکار کا تجزیہ بھی برابر ہو رہا ہے، اور آیندہ بھی طرح طرح کے زاویوں سے ہوتا رہے گا، لیکن ڈاکٹر جاوید اقبال کی زندہ رود کی تینوں جلدوں کو منفرد حیثیت برابر اس لحاظ سے حاصل ہوتی رہے گی کہ ان میں علامہ کی جو صبح و شام نظر آتی ہے یا ان میں ان کے افکار کی صبوحی تحریر کے بلوریں جام میں جس طرح جھلکتی دکھائی دیتی ہے کسی اور کتاب میں نہیں پائی جاتی۔

زیر نظر جلد میں علامہ کی حیات کے اختتامی دور کے احوال ہیں، یہ ۱۹۲۶ء سے شروع ہوتی ہے اور ان کی رحلت کے سال ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء پر آکر ختم ہو جاتی ہے یعنی کل بارہ سال کی تاریخ ہے، اس کو پڑھنے ان کی زندگی کے تین پہلو سامنے آتے ہیں، آپ کی سیاسی زندگی، آپ کی نجی زندگی، اور آپ کی وہ زندگی جو انھوں نے اپنی گہری نظر اور عمیق فکر کے ساتھ گذاری، ان کی سیاسی زندگی کی تفصیلات زیادہ ہیں، بیچ بیچ میں ان کی نجی زندگی کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں، پھر ان کی نظر وفکر پر بھی جا بجا مباحث ہیں۔

پہلی اور دوسری جلدوں کی طرح اس کی خوبی یہ بھی ہے کہ اس کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی مثنوی پڑھ رہے ہیں، جس میں اس کا ہیرو کبھی سیاست کے میدان عمل میں دکھائی دیتا ہے، کبھی بچوں کا شفیق باپ نظر آتا ہے، اور کبھی اس کا دل کون ومکان کے رازِ مضمر کو فاش کرکے ایک ابدی پیام چھوڑنے کے لیے متفکر ہے، ان تمام باتوں کو قلم بند کرنے میں لائق مصنف نے کبھی اپنی بذلہ سنجی، کبھی طرز ادا کی خوش سلیقگی، کبھی تحریر کی شگفتگی کا وہی رنگ اختیار کیا جو ان کے والد بزرگوار نے اپنے متعلق کہا تھا ع

کہ ہے ظریف وخوش آیندہ وشگفتہ دماغ

کتاب کے زیادہ تر حصے میں علامہ کی سیاسی سرگرمیوں کی تفصیل ہے، ہندوستان میں ۱۹۲۶ء سے

۱۹۳۸ء تک سیاسی حالات بہت ہی پر آشوب اور ہنگامہ خیز رہے، یہ زمانہ راقم کے عنفوان شباب سے شباب تک رہا، جب کہ وہ اس دور کے ملکی واقعات کو سیاست کے فلمی پردے پر دیکھتا رہا، اس کتاب میں اس مدت کی سیاست کی جو تفصیلات ہیں وہ متحرک تصویروں کی طرح پھر نظروں میں گھومنے لگتی ہیں، یہ مصنف کی بہت کمسنی کا زمانہ تھا، لیکن اس کے لکھنے میں ان کا انداز آنکھوں دیکھا حال کا ہے، یہ ان کی محنت اور تحریر کی خوبی ہے، اس دور کی سیاست مختلف زاویے سے بھی لکھی گئی ہے، اور لکھی جائے گی، لیکن جو زاویہ مصنف نے پیش کیا ہے اس سے چاہے کوئی کتنا اختلاف کرے، اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے، اور تمام زاویوں کے ساتھ اس زاویہ کا مطالعہ بھی بہر حال مفید ہوگا۔

بقول لائق مصنف علامہ کو فکری اعتبار سے سیاسیات سے گہری دلچسپی تھی، لیکن ۱۹۲۶ء سے پیشتر انھوں نے عملی سیاست میں حصہ نہ لیا تھا، اس سے پہلے شاعر بن کر خوش تھے جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے ؎

مرے سخن سے دلوں کی ہیں کھیتیاں سرسبز
جہاں میں ہوں میں مثال سحاب دریا پوش

وہ عملی سیاست میں اس وقت آئے جب ۱۹۲۶ء کے صوبائی انتخاب میں لیجسلیٹو کونسل کے ایک رکن کی حیثیت سے کھڑے ہوئے، ان ہی کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں اپنی قوم کے مصائب کے سبب سے ان کی راتوں کی نیند اچاٹ تھی، (ص ۳۰۲) ان مصائب کو دور کرنے کے لیے وہ پنجاب کی قانون ساز کونسل میں جانا چاہتے تھے، مگر اس انتخاب میں ان کے حریفوں نے ان کے خلاف الزام تراشی اور بہتان طرازی کی جو مہم چلائی (ص ۲۹۰) اور بعض اوقات جو شرمناک حرکتیں کیں، (۳۰۲) ان کو لائق مصنف نے گو دلچسپ انداز میں ضرور قلمبند کیا ہے، پھر بھی ان کی تفصیلات کو پڑھ کر دکھ ہوا، کہ اس فخر اسلام کی اہانت اس حد تک بھی ہو سکتی تھی، یا بعد میں مولوی ابو محمد دیدار علی نے ان پر جو کفر کا فتویٰ صادر کیا (ص ۳۴۳) اس سے اور تکلیف ہوئی۔

۱۹۲۶ء کے بعد ہندوستان کے اندر بڑے بڑے سیاسی واقعات ظہور پذیر ہوتے رہے، ان ہی میں عبد الرشید کے ہاتھوں سوامی شردھانند کا قتل، شدھی اور سنگٹھن کے جواب میں مسلمانوں کی تبلیغ اور تنظیم

جداگانہ اور مخلوط انتخاب کا جھگڑا، بمبئی سے سندھ کو الگ کرنے، صوبۂ سرحد اور بلوچستان میں دستوری اصلاحات کا نفاذ، پنجاب اور بنگال کی کونسلوں میں مسلم اکثریت کی بحالی، مرکزی اسمبلی میں مسلم نمایندوں کے تناسب کا مطالبہ، کشمیر کی آزادی کی تحریک، رنگیلا رسول کے مصنف کا قتل، سائمن کمیشن کی آمد پر تعاون اور عدم تعاون کا سوال، آل پارٹیز کانفرنس کی تجاویز، نہرو رپورٹ، محمد علی جناح کے چودہ نکات، گول میز کانفرنس، شاردا بل، احمدی تحریک کے خلاف شورش، مسلم لیگ کی دھڑ بندی، مولانا محمد علیؒ کی وفات، محمد علی جناح کی بددلی وغیرہ کی تفصیلات کا احاطہ مصنف نے محنت اور سلیقہ سے کیا ہے، علامہ پر جو سیاسی اثرات مترتب ہوتے رہے، ان کا تجزیہ بھی اچھی طرح کیا ہے، ان کو سمجھنے کے لیے ان کا مطالعہ ضروری اور مفید ہے، اور پھر انھوں نے مسلم ریاست کا جو تصور ۱۹۳۱ء میں پیش کیا، اس کی پوری تفصیل ہے، اس کو حق بجانب قرار دینے کے سلسلہ میں لایق مصنف کا بیان ہے کہ:

"اقبال نے مسلم ریاست کا تصور اس لیے نہیں پیش کیا تھا کہ وہ ہندوؤں سے کوئی بغض یا تعصب رکھتے تھے، وہ برصغیر کے سیاسی حالات کے ذاتی مشاہدہ اور تجربہ سے اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ دونوں مذہبی فرقوں میں اشتراک اقتدار کا کوئی قابل قبول سمجھوتہ ممکن نہیں، دو بھائیوں میں اگر اتفاق نہ ہو تو وراثت تقسیم کرنی پڑتی ہے، یہ انسانی زندگی، خاندانی یا اجتماعی زندگی کا خاصہ ہے۔" (ص ۴۰۱)

اس توجیہ پر ارباب سیاست بحث کر سکتے ہیں، ایک بہت اہم سیاسی واقعہ کی ایک توجیہ یہ بھی ہے پھر اس تصور کو عملی جامہ پہنانے میں جو سرگرمیاں دکھائی گئیں ان کی پوری تفصیلات اس کتاب میں ملیں گی، جو خوں ریز واقعات ہوتے، شاداب علاقوں کی جو بربادی ہوئی، عفت آبی کی جو غارت گری ہوئی، بیواؤں کی جو سسکیاں سنائی دیں، یتیموں کے جو نالے بلند ہوئے، لایق مصنف ان تفصیلات کو اپنے ہم وطنوں کے لیے دہرا دیتے تو اچھا تھا، تاکہ ان کو معلوم ہو جاتا کہ کتنی قربانیوں کے بعد یہ مملکت بنی، مصنف ان کو درج نہیں کر سکے ہیں، شاید اس کو اپنے موضوع سے خارج سمجھا ہو، مگر جس علاقہ میں علامہ محمد اقبال مسلم ریاست قائم کر کے اسلامی شریعت کا

نفاذ چاہتے تھے، وہاں کے عوام تو نہیں لیکن مفاد پرست اور خود غرض اکابر اپنی اپنی علحدہ پارٹیاں بنا کر ان کو شاید محض غزل خواں سے زیادہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھے، اسی لیے اپنی موت سے پہلے اپنے رسولؐ سے فریاد کی:

آں روزے کہ گفتم پے نبردند ز شاخِ نخلِ من خرما نخوردند
من اے میرِ امم داد از تو می خواہم مرا یاراں غزل خوانے شمردند

اور جب یہ تصور پاکستان کی شکل میں نمودار ہوا تو اس کا حال لایق مصنف نے یہ لکھا ہے:

"اسلامی ریاست کے تصور کو مسلمانانِ ہند کے متحدہ نصب العین کے طور پر مسلم لیگ کی قرارداد لاہور میں پیش کیا گیا، حصولِ پاکستان کے ایک سال کے بعد محمد علی جناح وفات پا گئے، ان کے بعد لیاقت علی خاں کے دور میں قرارداد مقاصد منظور کی گئی، لیکن مسلم لیگی یا دیگر سیاسی لیڈروں میں سے بیشتر اس اعلان کے باوجود کہ پاکستان ایک اسلامی ری پبلک ہے، پاکستان کو اسلامی مملکت ہرگز نہ بنانا چاہتے تھے، ...... ایم. اے اصفہانی نے جب تحریر کیا تھا کہ یہ کہنا کہ اقبال مسلم ریاست کے تصور کے خالق تھے، تاریخ کو مسخ کرنا ہے، تو آخر ان کا ذہن کس بات کی غمازی کر رہا تھا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں اسلامی عصبیت کے بجائے علاقائی تعصب کو فروغ ہوا، سیاست داں ناکارہ ثابت ہوئے تو بیورو کریسی نے اقتدار سنبھالا، اور بیورو کریسی کی نااہلی کے سبب فوج اقتدار میں آئی، انتخابات ہوئے تو غیر اسلامی نظریات کے حامل یا علاقائی تعصب کے بل بوتے پر اپنی سیاسی دکان چمکانے والے سیاستدانوں نے بالآخر ایک پاکستان کے دو ٹکڑے کر دیئے، اقبال نے غلاموں کو اسلامی اتحاد کا سبق دے کر آزادی کا راستہ دکھایا تھا، وہ برصغیر میں اس اسلامی انقلاب کے داعی تھے، جو بالآخر پاکستان کے قیام پر منتج ہوا، حقیقت یہ ہے کہ قیام پاکستان جدید عالم اسلام میں احیائے اسلام کی بنیاد پر پہلا اسلامی انقلاب تھا، لیکن اس کی تکمیل نہ ہو سکی۔" (ص ۴۲۶)

کیسا دردناک تجزیہ ہے اور یہ سب کچھ وہی لکھ سکتا ہے جس کے سرچشمۂ زندگی میں سچے شاعرانہ کچھ باقی رہ گئی ہے

دکھ یہ ہے کہ جس سرزمین سے یہ صدا اٹھی تھی ؎

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں محفلِ انجم بھی نہیں

وہاں اب چار قومیتوں کے نعرے بھی سنائی دیتے ہیں، اور یہ بھی کہ پاکستان کے بنانے والے پاکستان کے رہنے والے نہیں تھے، بلکہ پاکستان کے باہر کے رہنے والے تھے، اس کے لیے قربانی دینے والوں میں جو زندہ ہیں ان کی اکثریت اب بھی اپنی خاموش زبان سے ان بھٹکے ہوئے آہوؤں کو سوئے حرم چلنے کی خاطر ان کے لیے یہ دعا کر رہی ہے ؎

احساس عنایت کر آثار مصیبت کا
امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

مگر علامہ محمد اقبال کے نام کو ابدیت پاکستان کی مملکت کے ساتھ نہیں ہے، اور نہ اس نام کو پاکستان کے مرکزی سکریٹریٹ اور اس کی عسکریت کی ضرورت ہے، یہ بانگ درا کے ہر شعر میں محفوظ ہے، اسرار خودی اور رموز بے خودی کے جریدے میں اس کا دوام ثبت ہے، پیام مشرق کی سطروں میں اس کو پیام بقا مل چکا ہے، یہ زبور عجم کی صداؤں میں ہمیشہ سنائی دے گا، جاوید نامہ میں زندۂ جاوید رہے گا، بال جبرئیل کے نغموں میں سرمدی ہو چکا ہے، اس کی ضرب کلیم کے ذریعہ اس کا ہنگامۂ خاموش برپا رہے گا، ارمغان حجاز سے اس کے انکار کا ارمغان حاصل ہوتا رہے گا۔

ان کی سیاسی سرگرمیوں سے ہٹ کر ذرا ان کو ان کے سیاسی اور دوسرے قسم کے سفروں میں دیکھا جا سکتا ہے، جس کو مصنف نے اپنے مخصوص انداز میں قلم بند کیا ہے، اس کتاب میں ان کے جتنے سفرنامے درج ہیں، ان کو سمیٹ کر علحدہ کتاب میں شایع کر دیا جائے تو یہ ایک مستقل تصنیف ہو جائے گی، جو بہت ہی لطف و لذت کے ساتھ پڑھی جا سکتی ہے، ان میں تفصیل و اجمال اور اطناب و ایجاز دونوں کے مزے ملتے ہیں، جزئیات بھی سمیٹی گئی ہیں، لیکن اس حد تک جتنی کتاب کے ناظرین کا ذوق متحمل ہو سکتا ہے، بعض غلط فہمیاں بھی دور کی گئی ہیں، اور غلط بیانیوں کی تردید بھی کی گئی ہے، لیکن کسی لمحہ یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی بیٹا

اپنے باپ کی خواہ مخواہ مدافعت کر رہا ہے، آج کل کی اصطلاح میں تحریر میں جو معروضی انداز ہونا چاہیے وہی اختیار کیا گیا ہے، اس سفر و سیاحت کا مطالعہ کرتے وقت کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ابن بطوطہ اپنا ہی سفرنامہ مرتب کر رہا ہے، کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا لکھنے والا سفر کرنے والے کے ساتھ ساتھ سایہ کی طرح رہا، اور جو اس نے خود دیکھا وہی سپرد قلم کر دیا ہے، حالانکہ لکھنے والے نے یہ ساری تفصیلات دوسروں کی کتابوں اور تحریروں ہی کو سمیٹ کر لکھا ہے، لیکن اس کے سمیٹنے میں ایک ماہر اہل قلم ہونے کا ثبوت دیا ہے، ان سفرناموں سے علامہ کی زندگی کے گوناگوں پہلو سامنے آتے ہیں،

انھوں نے جنوری ۱۹۲۹ء میں جنوبی ہند کا سفر تو بظاہر اپنے ان انگریزی خطبات کو دینے کے لیے کیا جو بعد میں "ری کنسٹرکشن آف ریلیجس تھاٹس ان اسلام" کے نام سے شایع ہوئے، مگر اس سفر کا ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ وہ سلطان ٹیپو شہید کی تربت کی زیارت کریں، اور اس زیارت سے جو سوز و گداز کی کیفیت ان پر طاری ہوا اسے نظم کر کے لافانی بنا دیں، (ص ۳۴۴-۳) اس سفر کی غیر معمولی مشغولیتوں کے ساتھ جب وہ سرنگاپٹم پہونچ کر سلطان کے مقبرے کے گنبد سلطانی میں داخل ہوئے، تو قرآن مجید کی وہ آیت پڑھی جو شہداء کے لیے نازل کی گئی ہے، کہ جو اللہ کے راستہ میں مارے گئے انھیں مردہ مت کہو، وہ زندہ ہیں، پھر آنکھیں بند کر کے دیر تک قبر کے پاس کھڑے رہے، اور پوری عقیدت کے ساتھ فاتحہ خوانی کی، اس کے بعد روضہ کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد کے باہر اپنے اور ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ گئے، مہاراجہ میسور نے گانے والوں کا ایک طائفہ ساتھ کر دیا تھا، یہاں اس نے ان کا کلام بڑے سوز کے ساتھ گانا شروع کر دیا تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے جو تھمتے نہ تھے، اور حاضرین پر بھی رقت طاری تھی، اور جب وہاں سے رخصت ہوئے تو ان سے پوچھا گیا کہ کیا سلطان شہید نے کوئی پیغام دیا ہے؟ تو جواب دیا کہ ان کی معیت میں یہاں ایک لمحہ بھی بیکار نہیں گذرا، پھر فرمایا کہ یہ پیغام ملا ہے ؎

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مرداں جاں سپردن زندگی ست

یہ شعر اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جب سلطان سے یہ کہا گیا کہ وہ انگریزوں سے مصالحت کرلیں، تو جواب دیا کہ گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے، پھر داستہ میں اس کے ساتھ یہ چار شعر بھی موزوں کرلیے ہے

آتشے در دل دگر بر کردہ ام
داستانے از دکن آوردہ ام

در کنارم خنجرِ آئینہ فام
می کشم او را بتدریج از نیام

نکتہ گویم ز سلطانِ شہید
زاں کہ ترسم تیغ گردد دو زعید

بیشتر رفتم کہ بوسم خاکِ او
تا شنیدم از مزارِ پاکِ او

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مرداں جاں سپردن زندگی ست

مصنف نے ان اشعار کو سمجھانے کے لیے ان کے ترجمے بھی دے دیے ہیں، علامہ پر یہ اثر تھا کہ ان کو تو محسوس ہوا کہ اس تربت کی حاضری سے ان کے دل میں ایک آگ بھڑک اٹھی ہے، اور ان کے پہلو میں ایک ایسا چمکدار خنجر رکھ دیا گیا ہے جس کو وہ آہستہ آہستہ نکالتے رہیں گے، اور جب وہ اپنی مصیبت بیان کریں گے تو لوگوں کی عید کی خوشیاں جاتی رہیں گی، ان کو اس مزار سے یہ پیام بھی ملا کہ مردوں کی طرح زندہ رہنا ممکن نہ ہو تو پروانہ وار جان قربان کر دینے میں زندگی ہے۔

ضربِ کلیم میں "سلطان ٹیپو کی وصیت" کے عنوان سے ایک نظم ہے، یہ جاننے کی خواہش ہوتی ہے کہ کیا یہ نظم بھی سلطان شہید کے مزار پر حاضری کے وقت کہی گئی، یا بعد میں دل کے اندر نئی حرارت پیدا کرنے کی خاطر کہی گئی۔

علامہ نے جاوید نامہ میں سلطان ٹیپو کا کردار سلطان شہید کے نام سے پیش کیا ہے جس سے ان کے

سرنگاپٹم کے سفر کے دیرپا اثرات کا اندازہ ہوتا ہے، سلطان شہید پر بہت سے اشعار لکھے ہیں، حیات، مرگ اور شہادت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے اس کے متعلق لکھا ہے ؎

آنکہ گفتارش ہمہ کردار بود
مشرق اندر خواب و او بیدار بود

دوسری گول میز کانفرنس کے سفر کے کوائف اور بھی دلچسپ انداز میں لکھے گئے ہیں، جن کو پڑھتے وقت یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ سفرنامہ ختم نہ ہونے پائے، ستمبر ۱۹۳۱ء کو انگلستان جاتے ہوئے وہ عدن اور پورٹ سعید میں وہاں کے اکابر سے ملتے رہے، لوگوں کی بہت سی سیاسی غلط فہمیاں دور کرتے ہوئے لندن پہونچے تو گول میز کانفرنس کی کارروائیوں میں حصہ لینے کی تفصیلات کے ساتھ انگلستان کے اکابر سے جو ان کی ملاقاتیں ہوئیں یا کیمبرج اور لندن کی علمی و معاشرتی نشستوں میں ان کی جو تقریریں ہوئیں ان کا ذکر بہت ہی پر کیف انداز میں کیا گیا ہے، پھر وہ روم گئے، جہاں کے مشاہیر سے ملنے کے علاوہ مسولینی سے بھی ملاقات کی، جس کی تفصیل لائق مصنف نے بہت ہی تجزیاتی انداز میں لکھی ہے، علامہ کی دو نظمیں مسولینی پر ہیں، ایک تو بالِ جبریل میں ہے، جس کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے ؎

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ذوقِ انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ملت کا شباب

دوسری ضربِ کلیم میں ہے، جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے ؎

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم
بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج

یہ دونوں نظمیں متنازعہ فیہ بن گئی ہیں، کہ ان دونوں میں تناقض ہے، گو علامہ نے یہ کہہ کر مطمئن کیا ہے کہ اس بندۂ خدا میں ڈیول (شیطان) اور سینٹ (ولی) دونوں کی خصوصیات جمع ہوں تو اس کا میں کیا علاج کروں، (ص ۲۶۱) اس تناقض کا جواب تو مل جاتا ہے، لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ بالِ جبریل کی نظم کب کہی گئی، اور ضربِ کلیم کی نظم کس موقع اور کن حالات سے متاثر ہو کر کہی گئی ہے، تو اس تناقض کا حل معلوم ہو جائے گا، گو علامہ کے قدر دان ایسے نکل آئے ہیں جو یہ لکھتے ہیں کہ ان دونوں میں تناقض اس لیے

نہیں ہے کہ مسولینی اس زمانہ میں اٹلی میں ڈوچے کے نام سے مشہور تھا، اس کے متعلق صحافیوں نے ان کی رائے پوچھی تو فرمایا کہ ڈوچے ایک لوتھر ہے، مگر بغیر انجیل کے، اس سے اس کی پوری اسپرٹ سامنے آجاتی ہے، اور وہ انجام بھی جو اس کا ہوا۔

روم میں ہر قسم کے لوگوں سے مل ملا کر اور وہاں کی مجلسوں سے لطف اندوز ہو کر وہ نیپلز اور پمپئی، اور برنڈزی ہوتے ہوئے اسکندریہ پہونچے، جہاں کے اکابر سے ان کی ملاقاتیں رہیں، ان میں مصر کے مشہور صاحب طریقت بزرگ سید محمد قاضی ابو العزائم کی ملاقات کا ذکر بہت ہی پُر کیف ہے، ان کی ملاقات کے لیے حضرت ابو العزائم اپنے دو صاحبزادوں کے ساتھ اس ہوٹل میں تشریف لائے جہاں وہ مقیم تھے، ان کو دیکھ کر علامہ نے کہا میں خود زیارت کے لیے حاضر ہو جاتا، تو انھوں نے فرمایا خواجۂ دو جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے دین سے تمسک کیا ہو اس کی زیارت کو جاؤ گے تو مجھے خوشی ہوگی، لہٰذا میں اس ارشاد کی تعمیل میں چلا آیا ہوں، تاکہ میرے آقا مجھ سے خوش ہوں، علامہ یہ سن کر بےتاب ہو گئے، انھیں چُپ سی لگ گئی، حضرت سید ابو العزائم دیر تک بیٹھے نصیحتیں کرتے رہے، اور وہ خاموشی سے سنتے رہے، جب وہ چلے گئے تو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا کہ ایسا زمانہ بھی آگیا ہے کہ لوگ مجھ جیسے گنہگار کو متمسک بالدین سمجھ کر حضور خواجۂ دو جہاں کے ارشاد کے اتباع میں بغرض خوشنودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ملنے آتے ہیں (ص ۴۶۴) قاہرہ میں اکابر کی ملاقاتیں جاری رہیں، پھر ہر قسم کی پذیرائی کے بعد وہاں سے روانہ ہوئے تو فسطاط میں امام شافعیؒ کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھی، اسماعیلیہ اور قنطرہ ہوتے ہوئے فلسطین پہونچے، جہاں ایک موتمر کے اجلاس میں ان کو شرکت کرنی تھی، یہ موتمر مسلمانوں کے اتحاد و تعاون، صحیح اسلامی اخوت کی نشو و نما اور مسلمانوں کو اجتماعی اسلامی فرایض کی طرف متوجہ کرنے اور ان کے عقائد کو الحاد سے محفوظ رکھنے کے لیے منعقد ہوا تھا، یہاں سات دن تک قیام کر کے اس میں حصہ لیا اور اپنی ایک تقریر میں فرمایا کہ میں جب کبھی سوچتا ہوں تو شرم و ندامت سے میری گردن جھک جاتی ہے کہ ہم مسلمان آج اس قابل

ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر فخر کریں، ہاں جب ہم اس نور کو اپنے دلوں میں زندہ کر لیں گے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم میں داخل کیا تو اس وقت ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ حضورؐ ہم پر فخر کریں، (ص ۴۶۹)

مصنف نے اس کی طرف توجہ دلائی کہ علامہ عربوں کے اتحاد پر جاوید نامہ میں مہدی سوڈانی کے منھ سے اپنے عقیدے کا اظہار پہلے بھی کر چکے تھے، گو اس وقت تک یہ مثنوی شایع نہیں ہوئی تھی، پھر فلسطین میں وہ فلسطینی عربوں کے جوش و خروش سے یقیناً متاثر ہوئے، اور انھوں نے ایک نظم لکھی جس کو مصنف نے بھی نقل کیا ہے، (ص ۴۷۰) اس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ　　　میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے

یہ نظم ضرب کلیم میں بھی درج ہے، (ص ۶۲۱) اگر یہ فلسطین کے قیام کے زمانہ میں کہی گئی تو بال جبریل کے بجائے ضرب کلیم میں کیوں درج ہے، ضرب کلیم تو بال جبرئیل کے بعد شایع ہوئی، بال جبرئیل میں وہ نظم بھی ہے جس کا عنوان ذوق و شوق ہے، اس کے نیچے یہ لکھا ہوا ہے کہ ان اشعار میں سے اکثر فلسطین میں لکھے گئے، (ص ۴۰۳) مصنف نے اس نظم کا ذکر نہیں کیا ہے، بال جبرئیل میں یہ مسجد قرطبہ کے بعد اور مسولینی سے پہلے درج ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان نظموں کا اندراج ترتیب زمانی کے لحاظ سے نہیں ہے، لیکن ان مجموعوں کی ترتیب خود علامہؒ نے دی تھی، جس سے ظاہر ہے کہ اس میں ان کا اپنا ذوق کارفرما تھا، لیکن ترتیب زمانی ہوتی تو ان کے افکار کی ارتقائی منزلیں آسانی سے سمجھ میں آجاتیں۔

تیسری گول میز کانفرنس کے لیے ان کا سفر ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو شروع ہوا، اور وہ ۲۵ فروری ۱۹۳۳ء کو لاہور واپس آئے، اس درمیان میں گول میز کانفرنس میں حصہ لینے کے بعد پیرس اور اسپین کی بھی سیاحت کی، مصنف کے قلم سے یہ بات دلچسپی سے پڑھی جائے گی کہ انھوں نے اپنے والد بزرگوار سے لندن سے گراموفون لانے کی فرمایش کی تھی تو اس کے جواب میں انھوں نے وہ نظم

لکھ بھیجی جو بال جبرئیل میں "جاوید کے نام سے" درج ہے، اس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر

یہ معلوم ہو جانے کے بعد اس کے پڑھنے میں کچھ اور کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، یہ بال جبرئیل میں درج ہے، لیکن اس سے پہلے مصنف ہی کے نام سے وہ نظم درج ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سراغ
خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ

معلوم نہیں یہ کس موقع پر لکھی گئی، پھر ضربِ کلیم میں "جاوید سے" کے عنوان سے وہ غزل نما نظم ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

غارت گرِ دیں ہے یہ زمانہ
ہے اس کی نہاد کافرانہ

یہ کب لکھی گئی نہیں معلوم ہو سکا، اگر مصنف ان سب کی وضاحت کر دیتے تو علامہ کو باپ کی حیثیت سے سمجھنے میں مدد ملتی۔

اس سفر میں علامہ پیرس میں لوئی میسینون اور برگساں سے بھی ملے، میسینون نے منصور حلاج پر کام کیا تھا، اور انکی کتاب، کتاب الطواسین کے عربی متن کو ایک مدلل مقدمہ اور مفید حواشی کے ساتھ شایع کیا تھا، مصنف کا بیان ہے کہ اس تصنیف کو پڑھ کر حلاج کے متعلق ان کا نظریہ بدل گیا۔ (ص ۶۵۴) نظریہ کی اس تبدیلی کی نوعیت کا ذکر بھی مصنف کو کر دینا چاہیے تھا، وہ برگساں سے بھی ملے، جن سے نظریۂ واقعیتِ زمان پر خوب بحث ہوئی، اور جب علامہ نے ان کے روبرو اللہ تعالیٰ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنائی: لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ اِنَّ الدَّهْرَ هُوَ اللهُ، تو اس کو سن کر برگساں بہت متاثر ہوئے، اور بار بار پوچھتے رہے کہ یہ قول واقعی درست ہے؟ (ص ۶۹۶)

انھوں نے نپولین کے مزار پر بھی حاضری دی، جس کا ذکر کرنا مصنف بھول گئے ہیں، بالِ جبرئیل میں "نپولین کے مزار پر" کے عنوان سے جو نظم ہے اس میں جوش کردار پر زور دیا گیا ہے، نپولین کے ساتھ

تیمور کے سیلِ ہمہ گیر کا ذکر بھی ہے، پھر نظم کا رخ موڑ کر یہ لکھا گیا ہے کہ جوشِ کردار ہی سے صفِ جنگ گاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر خدا کی آواز بن جاتی ہے، اور یہ بھی ہے کہ جوشِ کردار کے مقابلہ میں فرصتِ کردار کے ایک دو نفَس کے عوض تبر کی شبہائے دراز ملتی ہے۔

فرانس ہی میں علامہ نے وہ نظم نما غزل لکھی جس کا مطلع یہ ہے ؎

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام
وائے تمنائے خام وائے تمنائے خام

یورپ کے متعلق علامہ کے جو خیالات تھے وہ اس مطلع سے ظاہر ہیں، مگر اس میں جو اور اشعار ہیں ان کو پڑھ کر یہ جاننے کی خواہش ہوتی ہے کہ کس موقع پر کن حالات سے متاثر ہو کر لکھے گئے، اس کے معلوم ہو جانے کے بعد ان کی تاثیر کی نوعیت شاید کچھ اور ہو جائے۔

پیرس سے علامہ اسپین پہونچے، جہاں ان کی مختلف مشغولیتوں کی تفصیل لطف و لذت سے پڑھی جا سکتی ہے، مصنف نے مسجد قرطبہ کی حاضری کی تفصیل لکھنے میں احسان نظر سے کام لے کر مستند روایتوں پر بھروسہ کیا ہے، یہاں علامہ پر جو کیفیت طاری ہوئی ہے، اس کا بہت ہی ولولہ انگیز ذکر ہے، اندلس کے قیام میں انھوں نے مسجد قرطبہ کے علاوہ کئی نظمیں لکھیں، دعا، عبد الرحمٰن کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت، ہسپانیہ، طارق کی دعا، ان سب کا ذکر مصنف نے نہیں کیا ہے، جس طرح وہ خاص خاص نظموں کے ذکر میں اس کا تناظر پیش کرتے رہے ہیں، اگر ان کے قلم سے ان کے تناظر کا بھی ذکر آ جاتا، تو ان تمام نظموں کے پڑھنے کی کیفیت اور لذت دوبالا ہو جاتی۔

علامہ کا یورپ کا یہ سفر آخری تھا، مگر پھر عرض ہے کہ ان کے افکار کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ انھوں نے یورپ کے مختلف مقامات میں جو نظمیں لکھی تھیں، ان کے موقع و محل کی تصریح کر دی جاتی، بالِ جبرئیل میں ایک چھوٹی سی نظم "یورپ سے ایک خط" کے عنوان سے ہے، اس کو اچھی طرح سمجھانے کی ضرورت تھی، بالِ جبرئیل ہی میں لینن، فرشتوں کا گیت، فرمانِ خدا، دین و سیاست، الارض للہ،

فلسفہ، مذہب کے عنوانات سے جو نظمیں ہیں، ان کے متعلق بھی یہ جاننے کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ کیا یورپ میں لکھی گئیں، یا وہاں سے واپسی پر منظوم ہوئیں، یا یورپ کے سفر سے پہلے ہی لکھی جا چکی تھیں۔

پھر ایک غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ

یہ تو واضح ہے کہ یورپ میں لکھی گئی، یہ صحیح ہے کہ ان موضوعات کے متعلق ان کے جو خیالات پختہ ہو چکے تھے، ان کا اظہار برابر کرتے رہے، ضرب کلیم میں افرنگ زدہ، مکہ اور جنیوا، مغربی تہذیب، عورت، مرد فرنگ، سیاسیات مشرق و مغرب، کارل مارکس کی آواز، یورپ اور یہود، بالشویک روس، سیاست افرنگ، جمہوریت، یورپ اور سود، انتداب، لادینی سیاست، جمعیت اقوام اور شام و فلسطین وغیرہ کے عنوانات سے جو نظمیں ہیں ان میں تو افرنگی سیاست، تہذیب اور سیاسی نظر و فکر پر اور بھی زیادہ حملہ آور ہوئے ہیں، یورپ کی روشنی علم و ہنر کے قائل ہونے کے باوجود انھوں نے اس کو ظلمات بے چشمۂ حیواں پایا، تو اس پر اپنے خیالات کا اظہار برابر کرتے رہے ان نظموں کے لکھنے کی بھی زمانی ترتیب معلوم ہو جائے تو ان کو اور ان کے خیالات کو سمجھنے میں اور بھی زیادہ مدد ملے، اگر سعی مشکور سے ایسی فہرست تیار کی جائے جس میں ان کی تمام نظموں کا سنہ و سال واضح کر دیا جائے تو ان کے نظام فکر و فن کی گیسوئے تابدار اور بھی تابدار بن سکتی ہے، یہ کوئی مشکل کام نہیں، ان پر اتنا لٹریچر فراہم ہو چکا ہے کہ تھوڑی سی کوشش سے یہ ضروری کام انجام پا سکتا ہے، صرف لائق مصنف کی توجہ کی ضرورت ہے، غالب کی غزلوں کو ترتیب زمانی کے ساتھ مرتب کرنے کی کوشش ہوئی تو ان کے ذہنی ارتقاء کا اندازہ ہوا، اس ارتقاء کا پتہ تو ان کے فن غزل گوئی کی خاطر لگایا گیا، لیکن علامہ کا کلام تو فکر بلند پر صفت برق اس لیے چمکتا ہے کہ ظلمت شب میں راہی بھٹکتے نہ پھریں، اور یہ کلام اس لیے بھی ہے کہ مسلمانوں میں چیتے کا جگر اور شاہین کا تجسس پیدا ہو، پھر اس کی ارتقائی منزلوں کو سمجھانے کے لیے ہر قسم کی محنت پیہم کی

ضرورت ہے۔

۱۹۳۳ء میں وہ افغانستان گئے، ان کے ساتھ سر راس مسعود اور حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ بھی مدعو تھے، وہاں کے حکمراں نادر شاہ نے تعلیمی امور کے مشورے کے لیے ان حضرات کو اپنے یہاں بلایا، اس سفر کا حال بھی مصنف نے اسی دلچسپ طریقے سے قلمبند کیا ہے، جیسا کہ ان کے اور سفروں کا کیا ہے۔

یہ وفد کابل پہونچا تو وہاں ہر قسم کے سرکاری اعزازات اور مدارات ہوئے، وہاں کے اکابر اور علمی حلقہ کے مشاہیر نے ان کو سر آنکھوں پر بٹھایا، اس سفر کے دلچسپ کوائف وہ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس طرح غزنین میں محمود غزنوی کے مزار پر حاضر ہوئے، حکیم سنائی کی آخری آرام گاہ کی زیارت کی، بابر کی قبر پر پہونچے، حضرت علی ہجویریؒ کے والد ماجد کی تربت پر دعائے مسنونہ پڑھی، مجذوب فقیر لائے خوار کی قبر پر بھی پہونچے، پھر قندھار پہونچے کہ خرقۂ شریف کی زیارت کریں، احمد شاہ ابدالی کے مقبرے کو دیکھا، پھر قندھار سے ارغنداب کا دلکش منظر دیکھتے ہوئے چمن پہونچے، اور جب علامہ اپنے وطن پہونچے تو انھوں نے اپنی سیاحت کے تاثرات اور جذبات کا اظہار اپنی تالیف مسافر میں کیا، جو ۱۹۳۴ء میں شایع ہوئی، لیکن جس وقت یہ لکھی جارہی تھی اس وقت نادر شاہ قتل کیے جا چکے تھے، یہ مثنوی ایک غزل کے سوا زیادہ تر مثنوی معنوی کی بحر میں ہے، اور بقول حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی خیبر، سرحد، کابل، غزنین اور قندھار کے عبرت انگیز مناظر، مفاخر پر شاعر اقبال کے آنسو ہیں، اور بابر، سلطان محمود، حکیم سنائی اور احمد شاہ درانی کی خاموش تربتوں کی زبان حال سے سوال و جواب ہیں، اس کا آغاز نادر شاہ شہید کے مناقب سے اور اختتام محمد ظاہر شاہ سے توقعات کے اظہار پر ہے، (ص ۵۲۹)

اسی سفر میں کابل میں انھوں نے وہ غزل لکھی جس کا مطلع یہ ہے ؎

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا
مروت حسن عالمگیر ہے مردانِ غازی کا

اس کا مقطع ان کے حسب حال تھا ؎

کہاں سے تونے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی
کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

یہ غزل بالِ جبریل میں درج ہے، اس سے علامہ کی بلند سیرت کا بھی اندازہ ہوگا۔

اس سفر میں حضرت الاستاد مولانا سید سلیمان ندویؒ مفکرِ اسلام سے جس طرح متاثر ہوئے اس کا اندازہ ان کے اس غمناک نثری نوحہ سے ہوگا، جو انھوں نے علامہؒ کی وفات پر لکھا تھا، اس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں:

"شاعری کی دنیا میں چالیسؔ برس چہچہا کر یہ بلبل ہزار داستان اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا، وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا، آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہوگئی، ایسا عارف فلسفی عاشق رسول شاعر، فلسفۂ اسلام کا ترجمان، اور کاروانِ ملت کا حدی خوان صدیوں کے بعد پیدا ہوا اسکے ذہن کا ہر ترانہ بانگ درا، اس کی جان حزیں کی ہر آواز زبور عجم، اس کے دل کی ہر فریاد پیام مشرق، اس کے شعر کا ہر پر پرواز بال جبریل تھا، اس کی فانی عمر گو ختم ہوگئی، لیکن اس کی زندگی کا ہر کارنامہ زندۂ جاوید رہے گا۔"

اس نوحہ سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ وہ کیا سمجھے جاتے تھے، اور بیرونی ملکوں میں ان کی پذیرائی اسی حیثیت سے ہوتی تھی، یہ ان کے لیے درس ہے جو ان کی زندگی اور شاید ان کی زندگی کے بعد بھی ہر قسم کی الزام تراشی اور بہتان طرازی میں مشغول رہے، یا ہیں، یا ان کو غلط فہمیوں کا شکار اور ساحرین برطانیہ کے سحر میں مبتلا سمجھتے رہے۔

اب ذرا اس کتاب کے ذریعہ سے ان کی خانگی زندگی کا بھی تھوڑا سا مشاہدہ کیا جائے، جن کی اخلاقی اور روحانی قدروں کو جاننے کے لیے ان کے شیدائی ان کے شاعرانہ کمالات اور ملی افکار ہی کی طرح بے چین رہتے ہیں، ان کے افکار پر تو اب تک بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، لیکن ان کی خانگی زندگی کا جو حال ان کے

فرزند ارجمند نے قلمبند کیا ہے، وہ اوروں کی تحریروں سے زیادہ وقیع ہے، بلکہ جس دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے، وہ کسی اور کتاب میں نہیں، پھر اس کی خوبی یہ ہے کہ ان کی خانگی زندگی پر لائق مصنف نے کوئی پردہ ڈالے بغیر سب کچھ قارئین کے سامنے پیش کردیا ہے، وہ اپنی والدہ ماجدہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ پرانی وضع کی خاتون تھیں، نماز پڑھتیں، روزے رکھتیں اور رمضان میں باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتیں، ضعیف الاعتقاد بھی تھیں، جن، بھوت، سایہ اور جادو وغیرہ سے بہت ڈرتی تھیں، مصنف کی سالگرہ پر ہمیشہ بکرے کی قربانی دیا کرتیں (ص ۲۷۶) گھر کے تمام افراد کے لیے کھانا خود پکاتی تھیں، ان کی مدد کے لیے فوجی دروازہ کی ایک ادھیڑ عمر کشمیری خاتون رحمت بی بی تھیں، جنھیں ہر چھوٹا ماں وڈی (بڑی اماں) کہہ کر بلاتا تھا، محلہ کی لڑکیاں ان سے قرآن مجید پڑھنے آتیں، اور گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹاتیں، ان میں سے بعض کی شادیاں انھوں نے ہی کروائی تھی، (ص ۲۹۵) علامہ نے ان کو کبھی اپٹوڈیٹ بنانے کی کوشش نہیں کی، ان کو شمع محفل بنانے کے بجائے ان کو ان کے حقوق ادا کرنے کی بڑی فکر رہتی، ایک بار درد گردہ میں مبتلا ہوئے تو ان کو خیال ہوا کہ زندگی کا کیا ٹھکانہ، ان کے لیے دس ہزار کی رقم سنٹرل کوآپریٹو بینک لاہور میں یہ لکھ کر جمع کردی کہ یہ روپے ان کے ہیں، اس رقم سے خود ان کا کوئی تعلق نہیں رہے گا، ان کے کچھ زیورات فروخت کردیے تھے، اس کے بدلے میں بھی پندرہ سو روپیے اور جمع کردیے، پھر ان کے نکاح کے وقت مہر کی کوئی رقم مقرر نہیں کی گئی تھی، انھوں نے اپنی مرضی سے ان کا حق مہر پندرہ ہزار روپیے مقرر کیے اور جب تک یہ رقم وصول نہ ہوئی ان کو ہر قسم کی جائداد منقولہ اور غیر منقولہ سے وصول کرنے کے حق کے علاوہ ان کی ہر قسم کی جائداد پر قابض اور متصرف رہنے کا حق بھی دیا۔ (ص ۳۷-۴۳۶)

مصنف کی والدہ کی بے حد خواہش تھی کہ رہنے کے لیے کوئی مکان بن جاتا، کیونکہ پورا خاندان کرایہ کے مکان میں رہتا تھا، علامہ نے ان کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے میو روڈ پر ایک قطعۂ زمین خریدا کوٹھی کی تعمیر ان کے، یعنی مصنف کی والدہ کے روزمرہ خرچ سے بچی ہوئی اور ان کے زیورات کی فروخت سے

حاصل کی ہوئی اور بینک میں ان کے نام سے جمع کی ہوئی رقموں سے ہوئی، اپریل ۱۹۳۵ء میں خاندان اس میں منتقل ہوا لیکن ۲۴ مئی ۱۹۳۵ء کو مصنف کی والدہ کا انتقال ہوگیا، اور وہ اپنی نئی کوٹھی کی بہار صرف ایک مہینہ دیکھ سکیں، مصنف کی عمر اس وقت گیارہ ۱۱ سال کی تھی، ان کی بہن منیرہ ان سے کئی سال چھوٹی تھیں، مصنف بہت ہی درد انگیز الفاظ میں لکھتے ہیں کہ جب ان کی والدہ کی تجہیز و تکفین کی تیاریاں ہونے لگیں تو وہ اپنی بہن منیرہ کا ہاتھ پکڑے روتے ہوئے اپنے والد ماجد کے کمرے کی طرف گئے، وہ اپنی چارپائی پر نیم دراز تھے، بہن بھائی دروازہ تک پہونچ کر ٹھٹھک گئے، یوں روتے دیکھ کر انھوں نے انگلی کے اشارہ سے قریب آنے کے لیے کہا، پھر اپنے پہلوؤں میں دونوں کو بٹھالیا، اپنا ہاتھ پیارے اکلوتے بیٹے کے کندھے پر رکھ کر قدرے کرختگی سے گویا ہوئے: تمھیں یوں نہ رونا چاہیے تم تو مرد ہو، مرد رویا نہیں کرتے، اس کے بعد اپنی زندگی میں پہلی بار بھائی بہن کی پیشانیوں کو چوما۔

اس کے بعد کی جو تفصیل ہے اس کو پڑھ کر میری طرح اس کتاب کے قارئین کو بھی تکلیف ہوگی، وہ لکھتے ہیں کہ جنازہ میں ان کے والد کے چند احباب شریک تھے، (ص ۵۴۹) اس آبروئے مشرق اور فخر برصغیر کی زندگی حیات کی رحلت پر تو ان کی غمگساری کی خاطر پورے شہر کو ٹوٹ پڑنا چاہیے تھا، لیکن ایسا کیوں نہیں ہوا، وہ سمجھ میں نہیں آتا، تدفین کے وقت علامہ انتہائی پریشانی کے عالم میں ایک پختہ قبر پر دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھے رہے، پھر ان کے مزار کے لیے جو قطعۂ تاریخ لکھا اس کا ایک مصرع یہ تھا؎

لالے کا خیاباں ہے مرا سینۂ پُر داغ

مرحومہ کی وصیت یہ تھی کہ وہ دونوں بچوں کو ایک دن کے لیے بھی اپنے سے جدا نہ کریں، اس پر ان کا عمل رہا، ان کی وفات کے بعد ایک بار زنانخانے میں آئے، جب مصنف کو بخار آگیا تھا، ایک کمرہ میں ان کی والدہ کی بڑی تصویر لگادی گئی تھی تو اس کو دیکھ کر خوش ہوئے، (ص ۶۱۹)

ان کو اپنی اولاد سے شروع سے بڑی محبت رہی، جب ان کی اہلیہ امید سے ہوئیں تو حضرت مجدد

الف ثانی کے مزار پر حاضری دی اور دعا کی، اور جب اللہ تعالیٰ نے ان کو بیٹا عطا کیا تو فوراً اپنے سارے کبوتر احباب میں بانٹ دیے، اور کبوتر بازی کے شغل کو اس لیے ترک کر دیا کہ کہیں یہ بھی بڑا ہو کر کبوتر اڑانے کی عادت نہ ڈال لے، (ص ۲۹۴) مصنف نے اپنے بچپن میں والدین کی محبت و سرزنش کا حال بہت ہی خوش مذاقی سے لکھا ہے، ان کو چھپانے کی کوشش نہیں کی ہے، لکھا ہے کہ ان کی والدہ اپنی محبت میں ان کو آٹھ نو برس کی عمر تک اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی رہیں، ان کے والد بزرگوار ان سے برابر یہ کہہ کر تکرار کرتے کہ یہ جوان ہو کر اپنے ہاتھ سے کھانا نہ کھا سکا تو کیا ہوگا، ان کی والدہ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا، البتہ کھلاتے وقت جب کبھی وہ ان کے قدموں کی آہٹ سن لیتیں تو اپنا ہاتھ پھرتی سے کھینچ کر آگے چمچہ رکھ دیتیں....

(ص ۴۷۶)

مصنف اس کے لکھنے میں بالکل نہیں ہچکچائے ہیں کہ اپنے بچپن میں اپنے والد بزرگوار کے ہاتھ سے کس کس طرح مار کھائی، ایک بار کی مار کا حال بہت ہی دلچسپ انداز میں کیا ہے، ایک روز وہ چپکے سے گھر میں کچھ کہے بغیر سینما دیکھنے چلے گئے، ساڑھے نو بجے رات کو چپ چھپا کر گھر پہونچے تو اپنے والد بزرگوار کے سامنے پیش کیے گئے، وہ غصہ کی شدت سے کانپ رہے تھے، مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو والدہ بیچ میں آکر کھڑی ہوئیں، اب ایک طرف ان کے والد بزرگوار تھے اور دوسری طرف ان کی والدہ تھیں، وہ جب مارنے کے لیے ہاتھ اٹھاتے تو والدہ ان کا ہاتھ پکڑ لیتیں، پھر دوسرا ہاتھ اٹھاتے تو وہ لپک کر اس کو بھی پکڑ لیتیں، وہ خود اپنے والد کی ٹانگوں سے چپکے ہوئے تھے، ان کی والدہ سراسیمگی کے عالم میں اچک اچک کر ان کے والد بزرگوار کا ہاتھ پکڑتی رہیں تو ان کے والد صاحب کو ہنسی آگئی، (ص ۴۷۷) مصنف لکھتے ہیں کہ عام طور سے وہ خفا ہوتے تو احمق، بے وقوف ہی کہہ کر ڈانٹتے، بعض اوقات غصہ کی حالت میں پنجابی یا اردو کے بجائے انگریزی میں ڈانٹتے، (ص ۴۷۷) ان کی محبت کا یہ عالم بھی رہا کہ بیٹا ایک بار منہ کے بل گر پڑا جس سے اس کا نچلا ہونٹ اندر سے کٹ گیا، خون جاری

ہو گیا، اس کو دیکھ کر شفیق باپ کو غش آ گیا، (ص ۲۷۸)

اپنی مالی پریشانیوں کے باوجود بچوں کے لیے بینک میں کچھ نہ کچھ رقم جمع کرتے رہے، جب مصنف کی والدہ بستر مرگ پر تھیں تو جاوید منزل کو مصنف کے نام سے ہبہ کر دیا، اور جب تک زندہ رہے اس کا کرایہ اپنے نابالغ بیٹے کے نام سے جمع کرتے رہے، پھر ان کے نام سے جو نظمیں لکھی ہیں ان سے بھی کیسی محبت ٹپکتی ہے، اللہ تعالیٰ کی یہ بے پایاں رحمت بیٹے پر رہی کہ ان کے والد بزرگوار کی دعائیں بڑی حد تک قبول ہوئیں،

مصنف نے اپنے والد بزرگوار کی مالی حالت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی تمام زندگی معاشی تنگی میں گذری، آخری چند برسوں میں علالت کے سبب وکالت چھوٹ گئی تھی، بیوی فوت ہو چکی تھیں؛ گھر کے اخراجات ان کو دو نابالغ بچوں کی نگہداشت اور تعلیم کے اخراجات برداشت کرنے پڑتے تھے، (ص ۳۰۵)

ان کی مالی پریشانیوں کا حال پڑھ کر قارئین کو ضرور دکھ ہوگا، آج ان کے نام پر جیسے روپیے خرچ کیے جا رہے ہیں، اگر اس کا عشر عشیر بھی انتظام کر کے ان کی مالی فراغت کا سامان کر دیا جاتا تو معلوم نہیں وہ ساز زندگی اور راز حیات کا کیا کیا پیام دے جاتے، اور سینۂ کائنات کے راز کو کس کس طرح فاش کر گئے ہوتے، مگر یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ وہ قلندر بن کر زندگی بسر کرتے رہے، کہیں مالی فراغت حاصل ہو جاتی تو کیا عجب کہ ان کا بدن بیدار اور روح خوابیدہ ہو جاتی، پھر ملت کے لیے بڑا المیہ ہوتا، ان کی مالی پریشانیوں کے باوجود جو ہر لحظہ نیا طور اور نئی برق تجلی دکھائی دیتی رہی ان کا اصل سرمایۂ حیات ہے، ان کے معاصروں میں بعض ایسے اکابر بھی تھے، جن کو جاہ و ثروت سب کچھ حاصل ہوا لیکن ان کو یاد کر کے کہا جا سکتا ہے ؎

ترا وجود ہے قلب و نظر کی رسوائی

علامہ اپنے متعلق جو یہ کہہ گئے ہیں کہ ؎

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے — خودی نہ بیچ فقیری میں نام پیدا کر

تو ان کی فقیری کی وجہ سے ان کا جو نام ہوا، وہ ان کے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کا سرمایۂ حیات ہے؎

نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے — جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

ان کی زندگی کا جو آنکھوں دیکھا حال ان کے نامور فرزند نے لکھا ہے اس کے جستہ جستہ ٹکڑوں سے قارئین کو کیف و نشاط ضرور حاصل ہوگا.

ایک عرب روزانہ ان سے ملنے آیا کرتے تھے، قرآن مجید پڑھ کر سناتے، ایک بار انھوں نے سورۂ مزمل پڑھی تو اتنا روئے کہ تکیہ آنسوؤں سے تر ہو گیا، قرآن مجید سنتے وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک کسی کی نوک زبان پر آ جاتا تو ان کی آنکھیں امنڈ آیا کرتی تھیں، رات گئے تک وہ جاگتے رہتے، کیونکہ انھیں عموماً رات کو تکلیف ہوتی تھی، اور جب شعر کی آمد ہوتی تو وہ اور بھی زیادہ بے چین ہو جاتے، چہرہ کا رنگ بدل جاتا، بستر پر کروٹیں بدلتے رہتے، کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتے، کبھی گھٹنوں میں سر دے دیتے، بسا اوقات وہ رات کے دو بجے علی بخش (ملازم) کو تالی بجا کر بلاتے، اور اسے اپنی بیاض اور قلم دوات لانے کو کہتے، جب وہ لے آتا تو بیاض پر اشعار لکھ دیتے، اشعار لکھ چکنے کے بعد ان کے چہرے پر آہستہ آہستہ سکون کے آثار نمودار ہو جاتے، اور آرام سے لیٹ جایا کرتے، ان کی عادت سر کے نیچے بازو رکھ کر بستر پر ایک طرف سونے کی تھی، اس حالت میں ان کا ایک پاؤں عموماً ہلتا رہتا جس سے دیکھنے والا یہ اندازہ کر سکتا کہ وہ ابھی سوئے نہیں، بلکہ کچھ سوچ رہے ہیں، جب گہری نیند سو جاتے تو زور سے خراٹے لیا کرتے تھے، صبح کی نماز بہت کم چھوڑتے تھے، گرمیوں میں دالان میں رکھے ہوئے تخت پوش ہی پر نیت باندھ لیتے، دھوتی اور بنیائن زیب تن ہوتی، اور سر پر تولیہ رکھ لیتے، سردیوں میں دھوتی اور قمیص پر دھسہ اوڑھ لیا کرتے تھے، ان کے کمرے کی حالت پریشان رہتی تھی، بستر ان کی دھوتی اور بنیائن کی طرح میلا ہو جاتا تو بھی بدلوانے کا خیال نہ آتا، چارپائی پر نیم دراز

پڑے رہنے میں بڑے مطمئن رہتے، بارہا دوپہر کا کھانا کسی کتاب کے مطالعہ میں منہمک ہونے کے سبب بھول جایا کرتے، اور جب وہ کتاب ختم ہو جاتی تو علی بخش کو بلوا کر معصومانہ انداز میں پوچھتے: کیوں بھئی! میں نے کھانا کھا لیا ہے؟ (ص ۶۱۹-۶۱۸) مرض الموت کے زمانہ کا حال بھی فاضل مصنف نے جس طرح لکھا ہے وہ بھی پڑھنے کے لائق ہے، وہ لکھتے ہیں:

قلب، گردے اور جگر سب ماؤف ہو چکے تھے، نیند آتی نہ تھی، اور مسلسل بے خوابی کا عالم طاری تھا، وقت کاٹنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا، پاس بیٹھے احباب سے کہتے کہ باتیں کیے جائیں، کبھی دیوان علی سے بلھے شاہ کی کوئی کافی یا ہدایت اللہ کی سی حرفی یا یوسف زلیخا سننے اور کبھی سید نذیر نیازی کو تاریخ اسلام کا کوئی واقعہ بیان کرنے یا کوئی ایسا افسانہ سنانے کی ہدایت کرتے جس میں بغداد، قاہرہ اور غرناطہ یا قرطبہ کا ذکر آتا ہو بعض اوقات کھانستے کھانستے غشی کی کیفیت طاری ہو جاتی، ایک دفعہ تو بے خبری میں پلنگ سے فرش پر گر گئے، ان ہی ایام میں دمہ کے پے در پے دو دورے کے بعد نیم بیہوشی کے عالم میں راقم نے انھیں دو مرتبہ اپنی خوابگاہ میں مرزا اسد اللہ خان غالب اور مولانا جلال الدین رومی سے باتیں کرتے سنا تھا، دونوں مرتبہ علی بخش کو بلوا کر پوچھا کہ مرزا غالب یا مولانا رومی ابھی اٹھ کر گئے ہیں، دیکھنا کہیں چلے تو نہیں گئے، علی بخش کے اس جواب پر کہ یہاں تو کوئی بھی نہیں تھا، فرمایا: چلو ٹھیک ہے۔ (ص ۶۷۰)

اپنی وفات سے پہلے اپنے ایک وصیت نامہ میں لکھا کہ میں عقائد دینی میں سلف کا پیرو ہوں، نظری اعتبار سے فقہی معاملات میں غیر مقلد ہوں، عملی اعتبار سے امام ابو حنیفہؒ کا مقلد ہوں (ص ۵۵۰) ان کی بڑی آرزو تھی کہ وہ حج کریں، ایک خط میں حیدرآباد کے وزیر اعظم سر اکبر حیدری کو لکھتے ہیں:

"ایک ہی خواہش جو ہنوز میرے جی میں خلش پیدا کرتی ہے یہ رہ گئی ہے کہ اگر ممکن ہو سکے تو حج کے لیے کر جاؤں، اور وہاں سے اس ہستی کی تربت پر حاضری دوں، جس کا ذات الٰہی سے بے پایاں شغف میرے لیے وجہ تسکین اور سرچشمہ الہام رہا ہے، میری جذباتی زندگی کا سانچہ کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ انفرادی انسانی شعور

کی ابدیت پر مضبوط یقین رکھے بغیر ایک لمحہ بھی زندہ رہنا میرے لیے ممکن نہیں، مجھے یقین پیغمبر اسلامؐ کی ذات گرامی سے حاصل ہوا ہے، میرا ذرہ ذرہ آنحضورؐ کی احسان مندی کے جذبات سے لبریز ہے، اور میری روح ایک ایسے بھرپور اظہار کی طالب ہے جو حضرت آنحضورؐ کے روضہ مقدس پر ہی ممکن ہے، اگر خدا نے مجھے توفیق بخشی تو میرا حج اظہار تشکر کی ایک شکل ہوگی۔" (ص ۶۰۹-۶۰۸)

حج کرنے کی آرزو تو ان کی پوری نہیں ہوئی، لیکن انھوں نے ارمغان حجاز میں حضور رسالت مآبؐ کے عنوان سے مکہ اور مدینہ کا جو خیالی سفر کر کے اس دربار سے اپنے جن والہانہ جذبات کا اظہار کیا ہے، کیا عجب کہ بارگاہ ایزدی سے ان کو وہی ثواب اور اجر ملے جو عشق الٰہی اور عشق رسول میں سرشار ہو کر حج کرنے والے ایک حاجی کو ملتا ہے۔

ان کی علالت کے زمانہ کی پریشانیوں کا حال مصنف نے جس طرح قلمبند کیا ہے اس کو پڑھ کر یہ دکھ بھرا جذبہ طاری ہوتا ہے کہ حرف راز کا سکھانے والا، نفس جبرئیل کا رکھنے والا، حریم ذات میں اپنی نوائے شوق سے شور برپا کرنے والا بیمار نہ پڑتا، اس کی زندگی اس کے سینے کے داغ سے لالے کا خیاباں بننے کے بجائے اس کی غزلوں کے تغزل کی طرح شروع سے آخر تک نشاط انگیز رہتی، مصنف نے اس دانائے راز کے جنازہ کی جو تفصیل لکھی ہے اس کو پڑھتے وقت قارئین کو ایسا معلوم ہوگا کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، کہ وزرائے حکومت، حکام اعلیٰ، عدالتوں کے جج، کالجوں کے پروفیسر، اساتذہ، طلبہ، شعراء، ادباء، صحافی، مشائخ، علماء، صناع اور پیدل اور سوار پولیس، سرخ پوش رضاکار، نیلی پوش والنٹیئر، خاکساروں کے جیش اور شہر کے ساٹھ ہزار آدمی جنازے کے ساتھ جا رہے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ میری طرح قارئین کو یہ بھی دکھ ہوگا کہ لوگوں نے اس میت کے ساتھ جس عقیدت کا اظہار کیا، اگر یہی عقیدت ان کی زندگی میں ظاہر ہوتی رہتی تو مصنف کو اپنے والد بزرگوار کی زبانی ان کی طویل علالت کی یہ دردناک کہانی نہ لکھنی پڑتی کہ:

"بعض احباب نے علاج کے لیے جرمنی اور آسٹریا جانے کا مشورہ دیا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہاں کے اخراجات میری استطاعت سے باہر ہوں گے، مزید براں یہ بات میرے بچوں کے ساتھ زیادتی کے مترادف ہوگی کہ عمر کے ان ڈھلتے ہوئے سالوں میں جب کہ میری زندگی کا کام عملاً انجام کو پہونچ چکا ہے، میں اپنی ذات پر اس قدر خرچ کروں" (ص ۶۰۰)

یہ صحیح ہے کہ اس مرغ لاہوتی کو اس رزق سے موت بہتر ہوتی جس سے اس کی پرواز میں کوتاہی ہوتی؛ مگر ان کے کلام کے مجموعوں ہی کو پوری فیاضی اور قدر دانی سے خرید کر ان سے اپنی محبت و شیفتگی کا ثبوت دیا جاتا تو مصنف کو یہ لکھنا نہ پڑتا کہ کوٹھی کی تعمیر کے لیے مزید روپیوں کی ضرورت تھی، ان کی خواہش تھی کہ جامعہ ملیہ ان کی طباعت پر رضامند ہو جائے تو انھیں اس اڈیشن کی رقم یکمشت اور فوراً ادا کر دی جائے، لیکن جامعہ ملیہ کی مالی مشکلات کے باعث یہ مسئلہ حسب منشا طے نہ ہو سکا، (ص ۵۴۲)

مصنف نے اپنے والد بزرگوار کی شیریں حکایتوں اور پرسوز روایتوں کو کچھ ایسی شیرینی اور دلسوزی سے قلمبند کیا ہے، کہ اس کتاب پر میرا یہ ریویو مضمون کی شکل میں منتقل ہو گیا، یہ طویل ہوتا جا رہا ہے، پھر بھی اس کی بہت سی باتوں کا ذکر باقی رہ گیا ہے، انھوں نے ان کی ملی نظر اور مذہبی فکر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس پر اظہار رائے رہا جاتا ہے، یہ کتاب علامہ کے آخری بارہ سال کی زندگی کے واقعات پر مشتمل ہے، اس مدت میں ان کے اہم ترین اور زریں کارناموں میں ان کی زبور عجم (۱۹۲۷ء) جاوید نامہ (۱۹۳۲ء) بال جبریل (۱۹۳۵ء)، ضرب کلیم (۱۹۳۶ء) مسافر (۱۹۳۴ء) پس چہ باید کرد اے اقوام شرق (۱۹۳۶ء) ارمغان حجاز (۱۹۳۸ء) کی اشاعت تھی، لائق مصنف نے ان پر اپنی کتاب میں زیادہ تفصیلی بحث نہیں کی ہے، یہ صحیح ہے کہ ان پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن وہ ان پر جو کچھ لکھتے وہ لذیذ سے لذیذ تر اسی طرح ہوتا جس طرح انھوں نے اپنے والد بزرگوار کی جانی بوجھی زندگی کے کوائف کو بنا دیا ہے، ان ہی مجموعوں سے ان کی آفاقیت کا اظہار ہوتا ہے، جن کے مطالعہ کے بعد کوئی ان کو ایک پنجابی شاعر قرار دے کر پنجاب کے پنجرے میں

بند نہیں کر سکتا ہے، (ص ۴۳۶) اس کتاب کی دوسری جلد میں وعدہ تھا کہ علامہ کے مسئلۂ وحدت الوجود اور صوفیانہ خیالات پر سیر حاصل بحث ہوگی، زیر نظر کتاب میں وہ اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ:

"اقبال نے وحدت وجود کو رد کرنے کے بجائے تو وحدت شہود کے مسلک کو اپنایا اور نہ وحدت وجود کے مسلک کی طرف واپس ہوئے۔" (ص ۶۶۸)

مگر اسی کتاب میں جب وہ پیرس میں لوئی میسیون سے علامہ کی ملاقات کا ذکر کرتے ہیں تو لوئی میسیون کے تاثرات کا حوالہ دیتے ہوئے انھی کی زبانی یہ روایت بھی قلمبند کی ہے:

"اقبال نے پیرس میں میرے ساتھ ملاقات کے دوران اس بات کا اقرار کیا تھا کہ وہ وحدت الوجودی نہیں بلکہ وحدت الشہودی ہیں۔" (ص ۴۹۶)

راقم نے زندہ رود کی جلد دوم پر ریویو کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ علامہ نے اس وحدت الوجود کو ضرور رد کیا جس میں غیر اسلامی رنگ پیدا ہو گیا تھا، لیکن وہ اسلامی وحدت الوجود کو کسی حال میں رد نہیں کر سکتے تھے، ان کے یہاں جو عشق کا تخیل ہے وہ یہی ہے جو وحدت الوجود کی قرآنی تعبیر ہے، وہ خودی کے ذریعہ سے خدا تک پہونچنے کی تلقین کرتے ہیں، ان کے یہاں تو اس کی برابر تلقین کی گئی ہے کہ زندگی کا موتی انسان کے جسم خاکی میں گم ہو کر رہ گیا ہے، اور اب یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ دنیا خود آدمی ہے یا خداوند تعالیٰ ہے، اور جب کبھی ان کا یہ شعر نوک زبان پر آئے گا کہ

درخاکدانِ ما گہرِ زندگی گم است — ایں گوہر ما گم شدہ مائیم یا کہ اوست

تو یہ خیال آئے گا کہ انھوں نے مروجہ غیر اسلامی توحید وجودی کو تو پسند نہیں کیا، لیکن ممکن ہے کہ ان کے تخیل میں کوئی ایسا توحید وجودی ہو جو ان کا اپنا ہو اور خالص اسلامی رنگ کا ہو، علامہ کے افکار میں اس مسئلہ کے علاوہ عقل، حواس خمسہ، عرفان، عشق، خودی، مکان، زمان، مرد کامل، مرد مومن، علم اور مذہبی مشاہدات، ذات الٰہیہ کے تصور، جبر، اختیار، حیات بعد الموت، اسلامی ثقافت کی روح اور الاجتہاد فی الاسلام، نئے علم کلام، فقہ اسلامی

کی نئی تدوین کی ضرورت، احیائے تمدن، اسلامی معاشی جمہوریت، اسلامی طرز حکومت وغیرہ پر برابر بحثیں ہوتی رہیں گی، ان مباحث میں نظری و فکری اختلافات بھی ہوں گے، لیکن لائق مصنف نے اپنی اس کتاب میں جس سلیس، عام فہم لیکن دل نشین انداز میں ان مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی ہے وہ ہر طرح لائق ستائش ہے علامہ کی کتاب 'دی کنسٹرکشن آف ریلیجس تھاٹس ان اسلام' کو سمجھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، فاضل مصنف نے اس کے مختلف خطبات کو بھی جس طرح سمجھایا ہے اس سے عام قارئین کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی، اس کے لیے علمی حلقہ کو ان کا ممنون ہونا چاہیے۔

اس کتاب کے ختم کرنے کے بعد ممکن ہے کہ اس کے بعض قارئین اس کے کچھ حصے سے اختلاف کریں، لیکن یہ شروع سے آخر تک جس انداز میں لکھی گئی ہے، اس سے اس کے ناظرین وہ ضرور متاثر ہوں گے کہ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں تصنع نہیں ہے، بیٹے نے باپ کی سوانح عمری لکھی ہے، لیکن ان کی زندگی کے کسی پہلو پر پردہ نہیں ڈالا ہے، تاویل یا حسن تاویل سے بھی کام نہیں لیا ہے، ان کی جن باتوں سے لوگوں نے اختلاف کیا، ان کا بھی ذکر کرتے گئے ہیں، ان کی گھریلو زندگی کے سارے پہلوؤں کو پیش کر دیا ہے، مگر جس کے متعلق وہ یہ سب کچھ لکھ رہے تھے، اس کی ادائے محبوبی میں کچھ ایسی دلنوازی رہی ہے کہ ان کے ذکر میں ان کی تحریروں میں دل نوازی کیونکر نہ پیدا ہو جاتی، یہی اس کتاب کی بڑی خوبی ہے۔

اقبال کامل

علامہ اقبال پر اردو میں روح اقبال کے بعد دوسری اہم اور لائق مطالعہ کتاب ہے، اس میں علامہؒ کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ ان کی اردو شاعری، فارسی شاعری، اور ان کی شاعری کے اہم موضوع فلسفہ خودی و بے خودی، نظریہ ملیت وغیرہ پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولفہ مولانا عبد السلام ندوی۔ قیمت ۲۲ روپے

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

عربی نگارشات عالیہ: تالیف و ترجمہ جناب شیخ نذیر حسین صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۳۴۴، قیمت درج نہیں، پتہ مرکز معارف اسلامی لاہور، پاکستان۔

عربی اس عہد کی مقبول اور نہایت مروج زبان ہے، جو مسلمانوں کے مذہب و ثقافت کی ترجمان، اسلامی علوم و معارف کا مخزن اور ہر قسم کے علمی، دینی، اخلاقی، تاریخی، تمدنی اور ادبی مضامین سے معمور ہے، جناب شیخ نذیر حسین، مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کو اس کا اور اردو زبان کا نہایت ستھرا ذوق ہے، اور وہ عربی سے اردو میں ترجمہ کرنے کا اچھا سلیقہ و تجربہ بھی رکھتے ہیں، اس سے قبل عربی کے مشہور عالم و ادیب ڈاکٹر احمد امین مصری کی بعض کتابوں کا اردو ترجمہ کر کے وہ اچھی شہرت حاصل کر چکے ہیں، اب انھوں نے عربی زبان کی علمی و ادبی حیثیت سے بلند پایہ متعدد نگارشات کا اردو ترجمہ کیا ہے جو دینی و اخلاقی حیثیت سے بہت سبق آموز اور گوناگوں علمی، تاریخی، ادبی اور تمدنی معلومات پر مشتمل ہیں، اس کتاب کی ابتدا قرآن مجید کی نہایت موثر اور معنی خیز آیتوں کے ترجمے سے کی گئی ہے، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ سیرت و شمائل اور آپ کے اور خلفائے راشدینؓ کے خطبات کا اردو ترجمہ کیا گیا ہے، اس کے بعد ہر دور کے مختلف طبقوں کے مشاہیر و اعلام کی مایۂ ناز تصنیفات سے نہایت بلیغ اور جاندار تحریروں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے، محدثین، ائمۂ دین اور حکمائے اسلام میں امام حسن بصریؒ، امام شافعیؒ، امام بخاریؒ، امام ترمذیؒ، امام غزالیؒ، امام ابن جوزیؒ،

امام ابن تیمیہؒ، امام ابن قیمؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے رشحات قلم اور صوفیہ و مشایخ میں شیخ عبد القادرؒ اور شیخ محی الدین ابن عربیؒ کے جواہر پاروں کے ترجمے دیے ہیں۔

اصحاب سیر اور مورخین میں ابن ہشام، بلاذری، طبری، ابو حنیفہ دینوری، مسعودی، ابن اثیر، ابن شداد، ابن خلکان، ابن خلدون اور احمد بن محمد مقری کی منتخب تحریروں کے ترجمے درج ہیں، ادیبوں اور انشاپردازوں میں ابن مقفع، جاحظ، ابن قتیبہ، احمد بن یوسف کاتب، ابن عبد ربہ، ابن حیان، ابو الفرج اصبہانی، بدیع الزمان ہمدانی، ابو حیان توحیدی، حریری، قاضی فاضل اور ضیاء الدین ابن الاثیر کے ادب پاروں کے اردو ترجمے دیے ہیں، اور سیاحوں میں ابن فضلان، ابن جبیر اور ابن بطوطہ کے سفرناموں کے دلچسپ اور معلوماتی ٹکڑوں کے ترجمے پیش کیے ہیں، گذشتہ اور موجودہ صدی کے ممتاز عربی مصنفین اور ارباب قلم میں شیخ محمد عبدہؒ، مصطفٰی منفلوطی، مصطفٰی صادق رافعی، احمد فرید رفاعی، سید رشید رضا، امیر شکیب ارسلان، امام حسن البناؒ، حسن زیات، ڈاکٹر طٰہٰ حسین، محمد کرد علی، ڈاکٹر احمد امین، عبد الوہاب عزام، عباس محمود عقاد، سید قطبؒ، محمد بن بشیر ابراہیمی، اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی زوردار اور بلیغ تحریروں کے نمونے دیے ہیں، اس سے کتاب کے تنوع و جامعیت کے علاوہ فاضل مرتب و مترجم کے حسن انتخاب اور علم و مطالعہ کی وسعت اور خود عربی زبان کی معنویت، گہرائی اور اثر انگیزی کا پتہ چلتا ہے، گذشتہ تیرہ صدیوں کی عربی نگارشات کا یہ انتخاب ہر لحاظ سے پاکیزہ، بلند اور دلکش ہے، شیخ صاحب نے بڑی خوش مذاقی اور محنت شاقہ سے رنگ برنگ کے مختلف پھولوں کو یکجا کر کے یہ حسین گلدستۂ علم و ادب تیار کیا ہے، حواشی میں انھوں نے ہر نثر نگار کے مختصر حالات بھی لکھے ہیں، اس میں اس کے علمی و ادبی درجہ کا تعین کر کے اس کے طرز نگارش کی خصوصیات دکھائی ہیں، خود مترجم کا اسلوب نگارش اور ترجمہ کی زبان بھی سلیس، شگفتہ اور دلآویز ہے، مگر اس میں دو ایک معمولی فروگذاشتیں بھی ہیں، جیسے ص ۱۶ پر جن آیتوں کا ترجمہ دیا گیا ہے اس کا عنوان جہاد میں ثبات کے بجائے محمدؐ اور ان کے اصحاب کے اوصاف مناسب ہوتا، ص ۱۶۱ و ص ۳۴۴ پر سیرت عمر بن عبد العزیزؒ کو ترجمہ مولوی ابو العرفان ندوی لکھا ہے، جو مولانا عبد السلام ندویؒ کی تصنیف ہے،

ص ۲۹۷ پر لکھا ہے: "عبادلہ میں حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور عمرو بن العاصؓ کے صاحبزادگان شامل تھے"۔ اس فہرست میں عبد اللہ ابن مسعودؓ، عبد اللہ ابن عباسؓ اور عبد اللہ ابن زبیرؓ کے اسماء قلم انداز ہو گئے ہیں، رہے حضرت ابو بکرؓ کے صاحبزادے عبد اللہ، تو غالباً ان کا انتقال بہت پہلے ہو چکا تھا، چنانچہ روایات میں ان کا نام نہیں ملتا، اور وہ اس فہرست میں شامل نہیں کیے جاتے۔

اردو شاعری میں مستعمل تلمیحات و مصطلحات

مرتبہ ڈاکٹر سید حامد حسین صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۲۰، مجلد، قیمت ۳۰ روپیے۔

پتے (۱) بھوپال بک ہاؤس، بدھواڑہ، بھوپال (۲) مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

اس کتاب میں اردو شاعری میں مستعمل اصطلاحات اور تلمیحات کی بقدر ضرورت تشریح و وضاحت کی گئی ہے، یہ دو حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ میں تاریخی واقعات قرآن مجید و حدیث شریف کے حوالوں اور نبیوں سے متعلق تلمیحات کا ذکر ہے، اور خاص طور پر مرثیوں میں مذکور اشخاص کے بارہ میں معلومات درج ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس حصہ میں واقعۂ کربلا اور اس سے متعلق افراد کا بکثرت تذکرہ ہے، دوسرے حصہ میں نجوم، رمل، فلکیات، منطق و فلسفہ اور تصوف وغیرہ کی اصطلاحات کا مفہوم واضح کیا گیا ہے، اس حیثیت سے یہ کتاب مفید ہے، اور اس سے اردو شاعری میں رائج اشارات، تلمیحات اور اصطلاحات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی، مگر یہ موضوع مزید کد و کاوش اور بحث و تحقیق کا متقاضی ہے، تاریخی واقعات کی تشریح کے ضمن میں ان کے وثوق و اعتبار کی صراحت ضروری تھی، اسی طرح کسی واقعہ کو صرف شیعی روایت و عقیدہ کے مطابق نقل کرنا ہی کافی نہ تھا، جیسے "ثقلین" کی تشریح میں لکھا ہے "مراد قرآن اور اہل بیت" (ص ۶۶) اور نور محمدی کی یہ تشریح کی ہے کہ "حضرت آدمؑ کی پیدائش سے چار ہزار سال قبل خدا نے ایک ہی نور سے رسولِ خداؐ اور حضرت علیؓ کو پیدا کیا تھا"۔ (ص ۲۴۰) اور پھر واقعۂ قرطاس (ص ۲۴۳) کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کے اختلاف کو ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی، خصوصاً جب یہ معلوم ہے کہ اختلاف کی روایت صحیح نہیں سمجھی جاتی اور

اس پر مولانا شبلیؒ نے الفاروق جلد اول ص ۵۴ تا ۵۸ میں بڑی لمبی بحث کی ہے، اس لمبی بحث کے بعد اس روایت کا ذکر کر دینا نہ کوئی علمی خدمت ہے نہ ادبی، بلکہ خواہ مخواہ کو اپنے سے بدظن کرنا ہے، آل یاسین کی تشریح میں لکھتے ہیں "سورۂ صافات کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں کہا گیا ہے سلام علی اٰل یاسین، مفسرین کا قول ہے کہ اٰل یاسین سے مراد آل محمد ہیں" (ص ۱۳۵ و ص ۲۵۵) حالانکہ معروف و متواتر قراءت کے مطابق یہ اٰل یاسین کے بجائے اِل یاسین ہے، جس سے مراد حضرت الیاسؑ ہیں، آل یاسین نہایت شاذ اور غیر معروف قراءت ہے، جس کو ہرگز متواتر و مشہور قراءت پر ترجیح نہیں دی جاسکتی، ص ۲۴۳ پر سورۂ قٓ رکوع ۲ کی پہلی آیت نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ کو غلطی سے سورۂ آل عمران رکوع ۱۱ کی آیت بتایا ہے۔

نفس مطلب :- مرتبہ جناب سید محمد حسنین صاحب تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۰۸، قیمت بیس روپے۔ پتے :- (۱) کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ ۴.....۸ (۲) انجمن ترقی اردو، اردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی۔

پروفیسر سید محمد حسنین صدر شعبۂ اردو مگدھ یونیورسٹی اردو کے اچھے اہل قلم اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں، یہ نئی کتاب ان کی ان تحریروں کا مجموعہ ہے، جو بعض ادبی تقریبات کے لیے لکھی گئی تھیں، لائق مصنف نے مضامین کے تنوع اور رنگارنگی کے باعث ان کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلے حصہ میں تنقید و تحقیق سے متعلق مضامین درج ہیں، دوسرے حصہ میں تعلیم و تدریس کے مسائل پر بحث و گفتگو ہے، ایک حصہ میں ادبی جلسوں کے خطبے دیے گئے ہیں، اور آخری حصہ میں اردو کی چار مشہور کتابوں پر مصنف نے تبصرہ کیا ہے، پہلے حصہ میں ۹ مضامین ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کی اردو تنقید و ادب پر اچھی نظر ہے، اور وہ ان موضوعات پر شائع ہونے والی نئی کتابوں کا دلچسپی سے مطالعہ بھی کرتے رہتے ہیں، اس حصہ کے ۲ مضامین میں "قلم کاری۔ تحریر کی صنفی ساخت" اور "تحریر، نثر اور نثر غالب" اس حیثیت سے اچھے ہیں کہ ان میں تحریروں کی ہیئت، رنگ و روپ، وضع اسلوب اور خصوصیات وغیرہ پر جو بحث کی ہے اس پر عمل پیرا ہو کر اہل قلم تحریر میں بے راہ روی سے محفوظ رہ سکتے ہیں،

دوسرے حصہ میں اردو اساتذہ کا منصب بھی واضح کیا ہے، اور ان کے فرائض بھی بتائے ہیں، اگر اردو کے اساتذہ مصنف کی باتوں پر عمل کریں تو آج کل کی بہت سی خرابیاں دور ہو سکتی ہیں، اس حصہ میں اردو کی عام اور بنیادی تعلیم پر مفید بحث کی گئی ہے، مصنف کے خطبوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اردو کے موجودہ مسائل اور مشکلات سے اچھی طرح واقف ہیں، اور ان کو حل کرنے کے لیے تڑپ اور دردمندانہ جذبہ رکھتے ہیں، مصنف کے تبصرے بھی باوزن ہیں، ان میں کتابوں کی خوبیوں کے ساتھ خامیاں بھی دکھائی ہیں، جوش ملیح آبادی کی کتاب "یادوں کی برات" پر ان کا تبصرہ اس کا نمونہ ہے، مصنف کی تحریر میں شگفتگی ہے، اور ان کا اپنا ایک خاص البیلا انداز بھی ہے، مگر ان کے یہاں اس طرح کے الفاظ کا استعمال بھی ملتا ہے جو ذوق سلیم پر گراں گذرتا ہے۔ مثلاً خارجیتی داخلیتی (ص ۲۳) ناثر و ناثرین (ص ۲۷ و ۵۳) کہانوی اصناف (ص ۵۸) جامعاتی شاخوں (ص ۱۴۲) حیرتی (ص ۲۰۶) فرق کی جمع افراق (ص ۸۳) اور صدق کی جمع اصداق (ص ۸۴) اور مرئی و مساعی (ص ۴۶) وغیرہ۔ ممکن ہے کہ اب یہ نئے ادیبوں کی زبان ہو، لیکن مصنف تو غالباً پرانے اساتذہ ہی کے قائل ہیں، ان کے لیے ان ہی کی زبان کا مقلد ہونا مناسب تھا۔

توضیحی فہرست کتب خانہ ہمدرد اشاعت ہائے خاص اردو رسائل مرتبہ جناب حکیم نعیم الدین زبیری صاحب تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت اعلیٰ، صفحات ۲۷۲ مجلد، مع خوبصورت گردپوش، قیمت چالیس روپے، پتہ :- ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ہمدرد سینٹر ناظم آباد کراچی ۱۸

حکیم محمد سعید صاحب کی ہمت عالی اور بلند حوصلگی کسی ایک ہی دائرہ میں محدود ہو کر قانع رہنا پسند نہیں کرتی بلکہ اپنی سرگرمیوں اور جولانیوں کے نئے نئے میدان تلاش کرتی رہتی ہے، ہمدرد کا وسیع اور عظیم الشان کتبخانہ ان ہی کی سعی و عمل، علمی سرپرستی اور حسن ذوق کا نتیجہ ہے، جس میں کتابوں کے علاوہ رسائل کا بھی وافر ذخیرہ موجود ہے، یہ کتب خانہ ہمدرد کے اردو رسالوں کے تقریباً بارہ سو خاص نمبروں کی توضیحی فہرست ہے، جس کو ہمدرد فاؤنڈیشن کے ڈائرکٹر ریسرچ اکیڈمک اور کتب خانہ کے نگراں مولانا حکیم نعیم الدین زبیری نے محنت و خوش ذوقی

سے مرتب کیا ہے، انھوں نے حروف تہجی کے اعتبار سے پہلے رسالوں کے نام لکھے ہیں، پھر زمانی ترتیب سے ان کا جو خاص اشاعتیں کتب خانہ میں موجود ہیں ان کا تذکرہ کیا ہے، ہر خاص نمبر کے ماہ و سال، جلد و شمارہ نمبر صفحات کی تعداد اور مدیر کے نام کی صراحت بھی کی ہے اور اس کے اہم مضامین کے عنوانات اور مضمون نگاروں کے نام بھی درج کیے ہیں، اس فہرست میں معارف کے سلیمان نمبر اور متعدد اہم اور قدیم رسالوں کے مفید اور کم یاب نمبروں کا ذکر ہے، جس سے علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی، مختلف کتب خانوں کے مطبوعات و مخطوطات کی فہرستوں کی اشاعت کا تو عام رواج ہے، مگر رسائل کے خاص نمبروں کی فہرست کی اشاعت غالباً پہلی مرتبہ ہوئی ہے، شروع میں جناب مسعود احمد برکاتی کے قلم سے اس کا مختصر تعارف بھی درج ہے، اس میں مختلف حیثیتوں سے رسائل و جرائد کی اہمیت دکھا کر ان کے تحفظ کی ضرورت و اہمیت بیان کی ہے۔

مصائب کا مداوا: شرح و ترجمانی ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۶۴، شایع کردہ دار العلوم حرم، مدرسہ صولتیہ، مکہ مکرمہ۔

شیخ یوسف بن محمد توزری الجزائری چھٹی صدی ہجری کے ایک عالم اور صاحب دل بزرگ تھے، ان کی تصنیفات میں القصیدۃ المنفرجۃ مناجات کے طرز کی ایک نظم ہے، اس میں ہر حال میں جادۂ تسلیم و رضا پر ثابت قدم رہنے اور مصائب و آلام کے ہجوم میں بھی جزع و فزع سے پرہیز اور یاس و حرمان کا شکار نہ ہونے کی تلقین کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ہر چیز کا وقت مقرر ہے، اس لیے مصائب بھی بالآخر ختم ہو کر رہیں گے، ایک بندۂ حق آگاہ کا فرض یہ ہے کہ وہ مشکل وقت میں بھی اللہ سے لو لگائے رکھے اور دعا و تضرع سے غافل نہ رہے، یہی اس کے درد کی دوا اور مرض کا مداوا ہے، شیخ کے موثر اور دلکش پیرایۂ بیان سے دعا و انابت کا خاص داعیہ پیدا ہوتا ہے، اسی لیے بعض مصری علماء اس کے ورد کا اہتمام کرتے ہیں، اور علامہ حسنین محمد مخلوف سابق مفتی اعظم مصر نے اس کی شرح بھی لکھی ہے، قصیدہ کی دلکشی و اثر انگیزی کی وجہ سے ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی استاذ جامعہ ام القریٰ مکہ کی توجہ بھی اس کی جانب مبذول ہوئی، اور انھوں نے اس کی سلیس و شگفتہ اردو شرح و ترجمانی کی، ڈاکٹر صاحب اردو و عربی

دونوں زبانوں کے ادیب ہیں، انھوں نے قصیدہ کے خیالات و مضامین کی وضاحت کرتے ہوئے جا بجا مناسب و برمحل اردو، فارسی اور عربی اشعار بھی نقل کیے ہیں، جن سے لطف دوبالا ہو گیا ہے، وہ علم و ادب کی طرح تصوف و معرفت کے لذت شناس بھی ہیں، اس کی وجہ سے بھی ان کی شرح و ترجمانی میں خاص کیف، حلاوت اور لذت پائی جاتی ہے۔

عبداللطیف اعظمی حیات و خدمات: مرتبین: انور صدیقی، شمیم حنفی، شہیر الحق، مظفر حنفی، عبدالحق خان، محمد انس، شاہد علی خان، خالد محمود صاحبان، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۸۰، مجلد، قیمت اٹھارہ روپیے، پتہ ماہنامہ کتاب نما جامعہ نگر، دہلی ۲۵۔

جناب عبداللطیف اعظمی طویل مدت سے اردو زبان و ادب اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی خدمت اخلاص و سرگرمی سے انجام دے رہے ہیں، اس کے اعتراف کے طور پر ماہنامہ "کتاب نما" نے یہ خصوصی شمارہ شایع کیا ہے، جو عبداللطیف صاحب کے جامعی احباب کے علاوہ خود ان کی اور ان کی بیگم کی نگارشات پر مشتمل ہے، شروع میں جناب اخلاق الرحمن قدوائی سابق گورنر بہار کا پیغام ہے، اور آخر میں عبداللطیف صاحب کی تصنیفات اور اب تک کے مشاغل کا اجمالی ذکر ہے، مگر کسی مضمون میں ان کی تصنیفات پر بحث و تبصرہ کر کے ان کی اہمیت اور ادبی قدر و قیمت نہیں دکھائی گئی ہے، البتہ اکثر میں عبداللطیف صاحب کے مزاج و طبیعت کی نمایاں خصوصیات کا ذکر ہے، جیسے کام کی لگن، فرض شناسی اور اس میں عدم رو رعایت، مطالعہ و تحقیق سے دلچسپی، تکثیر کلام، بحث و مباحثہ کی عادت، اور ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ ولادت کی جستجو و تعیین میں انتہائی موشگافی وغیرہ، جس طرح عبداللطیف صاحب بڑے دلچسپ اور باغ و بہار آدمی ہیں اسی طرح ان پر لکھے جانے والے مضامین بھی دلچسپ ہیں، مگر اکثر مضامین میں شوخی و بے تکلفی مذاق کی حد تک بڑھ گئی ہے، انور صدیقی صاحب تو دوسری شخصیتوں سے بھی شوخی پر اتر آئے ہیں، انھوں نے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کو ان مدرسوں میں شمار کیا ہے جن کا طریقۂ تعلیم درس نظامی ہے، یہ صحیح نہیں ہے۔

ہندوستانی فارسی ادب: از پروفیسر سید امیر حسن عابدی صاحب تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۲۰، مجلد مع گردپوش، قیمت ۴۰ روپیے، ناشر انڈو پرشین سوسائٹی ۱۸۳۸، شیخ چاند اسٹریٹ، لال کنواں دہلی ۱۱۰۰۰۶۔

پروفیسر سید امیر حسن عابدی صدر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی فارسی زبان و ادب کے متبحر عالم ہیں، انھوں نے فارسی زبان و ادب کی متعدد اہم اور نادر کتابوں کو اپنے عالمانہ مقدموں کے ساتھ شایع کرنے کے علاوہ اس موضوع پر سینکڑوں علمی، ادبی و تحقیقی مضامین بھی لکھے ہیں، اب ان کے شاگرد اور رفیق کار ڈاکٹر شریف حسین قاسمی نے زیر نظر مجموعہ میں ان کے مقالات کا انتخاب شایع کیا ہے، یہ چودہ مضامین پر مشتمل ہے، پہلے مضمون میں فارسی زبان و ادب کی ترویج و توسیع میں ہندوستان کا حصہ دکھایا گیا ہے، یہ مضمون گو مختصر ہے مگر اس میں زیر بحث موضوع کی اکثر ضروری اور اہم باتوں کا تذکرہ ہے، اور شروع سے اب تک فارسی زبان میں ہونے والے کاموں کا اجمالی جائزہ بھی ہے، اس سلسلہ میں اہم مؤلفین اور مؤلفات کے نام بھی گنائے گئے ہیں، مگر اس مقالہ میں یہ معمولی کسر رہ گئی ہے کہ مرزا غالب کے بعد کے فارسی گو شعرا میں ڈاکٹر اقبال اور اقبال سہیل کا تو تذکرہ ہے مگر علامہ شبلی اور بعض دوسرے فارسی گو شعرار کا ذکر رہ گیا ہے، دوسرے مقالہ میں فردوسی کے شاہنامہ کی فارسی زبان و ادب میں اہمیت دکھانے کے بعد ہندوستان میں اس کی غیر معمولی پذیرائی اور اس سے والہانہ شغف کا حال بیان کیا ہے، اس سلسلہ میں شاہنامہ کے مختلف قلمی نسخوں کا ذکر بھی کیا ہے، تیسرے مضمون میں سنسکرت زبان سے فارسی زبان میں ترجمہ کیے جانے والے تحریری کاموں کا دقت نظر سے جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ ہندوستان کی اہم مصنفات فارسی زبان و ادب کے خدمت گذاروں کی سرگرمیوں کا خاص محور رہی ہیں، چوتھے مضمون میں امیر خسرو کی مثنوی تغلق نامہ کے تکملہ کے متعلق جناب ہاشمی فریدآبادی کے اس خیال کی دلائل سے تردید کی ہے کہ اس کے تکملہ نگار حیاتی کاشی کے بجائے حیاتی گیلانی تھا، چند مضامین میں بعض شعرا اور اہم تصنیفات کا پہلی مرتبہ مفصل تعارف کرایا گیا ہے، ایک مضمون میں اردو کے مشہور شاعر نظیر اکبرآبادی کے فارسی رسائل اور شاعری پر بحث کی ہے، جدید فارسی زبان و ادب سے متعلق بھی دو محققانہ مضامین درج ہیں "ایران کا سماجی اور انقلابی ادب" اور "ایران کا بیادگذار شعر" یہ سب مضامین عابدی صاحب کی تلاش و جستجو اور تحقیق کا نتیجہ ہیں اور ان سے فارسی زبان و ادب سے ان کی شیفتگی کے علاوہ اس میں گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے، یہ مجموعہ فارسی زبان و ادب کے شیدائیوں کے لیے خاص طور پر لائق مطالعہ ہے۔

"ض"

جلد ۱۳۶ ماہ صفر المظفر ۱۴۰۶ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۸۵ء عدد ۵

مضامین

شذرات	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	۳۲۲ - ۳۲۴
مقالات		
مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم و فنون اور مستشرقین	مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم	۳۲۵ - ۳۳۶
مولانا سید سلیمان ندوی کے علمی کارناموں پر ایک نظر	پروفیسر خلیق احمد نظامی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۳۳۷ - ۳۵۸
دراقت: کتاب منزل بہ منزل	مولانا محمد عبدالحلیم چشتی، کانونا، نجیریا	۳۵۹ - ۳۸۰
مولانا حمید الدین فراہیؒ کے اساتذہ	ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، ریڈر ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، پاکستان	۳۸۱ - ۳۹۱
وفیات		
آہ مولانا محمود الحسن	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	۳۹۲ - ۳۹۴
مطبوعات جدیدہ	"ض"	۳۹۵ - ۴۰۰